Rs.30/-

اگست ۲۰۲۱ء

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ

حیاتِ نو

دہلی

انجمن ہاسٹل

Anjuman Hostel

Jamiatul Falah, Bilariaganj, Azamgarh, U.P. India

فنیشنگ کے اخراجات کا تخمینہ

₹ 2,40,000	*Cost of one ROOM*	ایک کمرے کا تخمینہ (۴ طلبہ)
₹ 60,000	*Cost of one BED/STUDENT*	ایک طالب علم کے لیے زرِتعاون
₹ 6,00,000	*One WARDEN HOUSE*	ایک وارڈن ہاؤس کے لیے زرِتعاون
₹ 48,00,000	*Cost of one FLOOR (14 Rooms + WH + Wash Room)*	ایک منزل کا تخمینہ (۱۴ کمرے + ایک وارڈن روم + واش روم (٦ لیٹرین، ٦ باتھ روم، وضوخانہ)

Account Details:

ANJUMAN HOSTEL JAMIATULFALAH

A/C: **35782469846** | IFSC: **SBIN0012473**

State Bank of India, Bilariyaganj

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

9005165351, 7275538979

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو دہلی

مدیر مسئول : سیدراشد حامدی مدیر اعزازی : ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

مدیر معاون : محمد اسعد فلاحی

جلد۔۶ ، شمارہ ۔ ۸ | اگست ۲۰۲۱ء | ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ، محرم الحرام ۱۴۴۳ھ

ادارتی امور کے لیے رابطہ کریں: 9927206518،8287025094 | انتظامی امور کے لیے رابطہ کریں: 8287025094

ای میل: jareedahayatenau@gmail.com

فی شمارہ	:	اندرون ملک	۳۰/روپے
		بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
خصوصی شمارہ	:		۱۰۰/روپے
سالانہ زرتعاون	:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
		بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
		بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

مجلس ادارت

۱۔مولانا ظفر احمد اثری فلاحی، لندن
۲۔ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، علی گڑھ
۳۔مولانا انعام اللہ فلاحی، دہلی
۴۔مولانا عبدالبر اثری فلاحی، ممبئی
۵۔مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، جامعۃ الفلاح
۶۔امتیاز وحید فلاحی، کولکاتا
۷۔محمد انس فلاحی مدنی، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی

ہمارے نمائندے

۱۔رضوان احمد فلاحی، لندن
۲۔موسیٰ کلیم فلاحی، متحدہ عرب امارات
۳۔حسن حبیب فلاحی، نیپال
۴۔فیاض احمد فلاحی، قطر
۵۔محمد سموئیل فلاحی، کویت
۶۔ڈاکٹر انعام اللہ فلاحی، سعودی عرب
۷۔ذوالقرنین حیدر فلاحی، ملیشیا

★ رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگوانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

★ مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
Printed at: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Ziauddin Falahi**

نقوشِ حیات

ادار یہ — ضیاءالدین ملک فلاحی — ۴

قرآنیات

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر [۴۱] — محی الدین غازی — ۸

دعوت اسلامی

عائلی نظامِ زندگی پر مغربی تہذیب وثقافت کے اثرات — محمد اسامہ — ۲۱

دعوتِ دین: فریضہ اور تحفظ ملت کا سامان — محمد انس فلاحی مدنی — ۳۶

سفرِ ہجرت اور صحابیات — ثمرہ یعقوب فلاحی — ۵۰

علم و تحقیق

اسلامی سرمایے کی تحقیق واشاعت میں ہندوستانی فضلاء کا کردار — محمد صادر ندوی — ۵۳

یادِ رفتگاں

مولانا مقبول احمد فلاحی مرحوم — مولانا انعام اللہ فلاحی — ۶۳

حبیب حامد عبدالرحمٰن الکاف سے تحریری انٹرویو — رضوان احمد فلاحی — ۶۸

بحث و نظر

۱۰ رمحرم: یومِ خلافتِ راشدہ — صباح الدین ملک فلاحی قاسمی — ۸۵

اسلامی اور مذہبی رواداری — فلاح الدین فلاحی — ۸۹

ہندوراشٹر کی طرف بڑھتے قدم — محمد غالب فلاحی — ۹۶

سوشل میڈیا: انسٹا گرام کی سرگزشت — صوفیہ خان فلاحی — ۹۹

بزم ادب: ابنِ صفی۔ عظیم مفکر، بے مثل ادیب — عبداللہ زکریا — ۱۰۳

جامعہ کے لیل و نہار — مصباح الباری فلاحی — ۱۱۴

اخبار انجمن — ادارہ — ۱۱۷

مقالہ نگاران

۱-ڈاکٹر محی الدین غازی، سکریٹری شعبۂ تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند

۲-ڈاکٹر محمد اسامہ، گیسٹ لیکچرر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۳-مولانا محمد انس فلاحی مدنی، رفیق ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۴-محترمہ ثمرہ یعقوب فلاحی، استانیہ جامعۃ الفاح، بلریا گنج اعظم گرغ یوپی

۵-مولانا محمد صادر ندوی، ریسرچ اسکالر، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۶-مولانا انعام اللہ فلاحی، سابق جنرل سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

۷-جناب رضوان احمد فلاحی، لندن

۸-مولانا صباح الدین ملک فلاحی قاسمی، استاد فقہ جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ یوپی

۹-جناب فلاح الدین فلاحی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

۱۰-مولانا محمد غالب فلاحی، ریسرچ اسکالر، اسلامی اکیڈمی نئی دہلی

۱۱- صوفیہ خان فلاحی، ممبئی

۱۲- جناب عبداللہ زکریا، علاء الدین پٹی، مقیم حال ممبئی

۱۳- مولانا مصباح الباری فلاحی، استاد جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

۱۴-ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، مدیر حیات نو، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو علی گڑھ

فروغِ انسانی وسائل: ایک دینی وتمدنی ضرورت

انسان کو اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اسے خیر و شر کی تمیز بخشی گئی اور اختیار و ارادہ کی بھرپور آزادی عطا کی گئی ہے۔ اس کی ہدایت کے لیے آسمانی صُحف اور ان کے شارحین: انبیاء علیہم السلام کی شکل میں مبعوث کیے گئے۔ اس اہتمام کا مقصود یہ تھا کہ انسان کو 'عہدِ الست' کی یاددہانی کرائی جاتی رہے اور معرکۂ خیر و شر سے گزار کر وہ اسے اخروی سعادت سے ہم کنار کر دیا جائے۔

انسان کو انبیائی مشن کے لیے تیار کرنا خود اس عہد کی تکمیل کے لیے ضروری و لازمی ہے کہ اس انبیائی مشن کو قرآن 'اقامت دین' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اقامت دین کے تقاضے پوری انسانی زندگی کو محیط ہیں۔ یعنی پیدائش سے موت تک کی مہلت کو اللہ کے اوامر اور نواہی کے تحت گزارنا۔ درحقیقت یہ اوامر و نواہی فرد اور معاشرہ کو محیط ہیں۔ چنانچہ تزکیہ و تربیت کا یہ عمل فرد اور اجتماع کے ذریعہ ایک مکمل تمدن کو تشکیل دیتا ہے، جس کا مثالی نمونہ نبی آخر الزماں ﷺ کے ذریعہ مدینہ کی اسلامی ریاست کی شکل میں قیامت تک کے لیے پیش کر دیا گیا ہے۔ اس تحریر میں بنیادی طور پر انسانی وسائل کے فروغ اور ترقی پر گفتگو کی جائے گی۔ یہ گفتگو معاصر عہد میں اس لیے بھی ضروری ہے کیوں کہ آج انسانی وسائل کا فروغ اور ترقی الٰہی ہدایت سے بے نیاز اور آزاد ہے۔ چنانچہ سائنس و ٹکنالوجی کی محیر العقول ترقی کے باوجود دنیا کو قلبی و ذہنی سکون میسر نہیں۔ سماجی طبقات عدم توازن کا شکار ہیں۔ مادی وسائل کی تقسیم عادلانہ بنیادوں پر استوار نہیں ہے اور دنیا کے انتہائی متمدن کہلانے والے خطے خالق کائنات کے مقصدِ تخلیق سے آج تک ناآشنا ہیں۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ انسانی وسائل کے فروغ کو خدا شناس بنایا جائے تاکہ اسلام کا کائناتی نقطۂ نظر (World view) واضح ہو سکے۔

انسانی وسائل کا عنوان تقاضہ کرتا ہے کہ انسان کو خلافت کی انجام دہی کے لیے ماحول فراہم کرے۔ ایک خوش گوار معاشرہ تشکیل دے۔ پوری انسانیت کے سامنے دین کی اقامت کرے۔ مادی وسائل کو اس کام میں لگائے، دنیاوی وسائل کی آمد و صرف اور صنعت و حرفت کا اسلامی رخ متعین کرے، دنیاوی وسائل کے تصرف میں احساس ذمہ داری پیدا کرے، عامۃ الناس کو خدا کا مطیع و فرمان بنانے کی جدوجہد کا حصہ و آلۂ کار بنائے اور انسان کے اندر قیادت و سیادت کی لیاقت پیدا کرے اور انسانی وسائل کے فروغ کے لیے قائدانہ صلاحیت کی افزائش کرے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر دور کا چیلنج وسائل کو اپنے اہداف کی تکمیل کے لیے

استعمال کرتا ہے اور یہ چیلنج وہی ہے جو ’’عہد الست‘‘ کے اظہار کے وقت شیطان نے روگردانی، نافرمانی اور منفی رجحانات کی افزائش کی اجازت کی صورت میں حاصل کیا تھا۔ چنانچہ انسانی وسائل کا استعمال آغاز آفرینش سے مثبت اور منفی انداز میں ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک دراز رہے گا۔

انسانی وسائل کے فروغ کی عالمانہ بحثیں اسلامی مفکرین اور سماجی اسکالرز کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ابونصر فارابی (۸۷۰۔۹۵۰ء) نے مبادی آراء اهل الدينيه الفاضله اور السياسة المدنيه میں، جب کہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (۱۳۳۲۔۱۴۰۶ء) نے تاریخ العبر و دیوان المبدأ والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرهم من ذوی السلطان الاکبر میں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳۔۱۷۶۲ء) نے حجة الله البالغه اور دیگر تحریروں میں شرح و بسط کے ساتھ کیا ذکر ہے۔ حضرت شاہ نے انسانی وسائل کے لیے ’الارتفاقات کی‘ اصطلاح وضع کی، جب کہ فارابی نے ’المدینۃ الفاضلۃ‘ کا وژن دیا۔ بہرکیف اسلامی سماجیات کے مطالعہ میں انسانی وسائل پر فکری مباحث کا وقیع ذخیرہ موجود ہے۔ یہ مباحث انسانی وسائل کے اسلامی تصور کی عملی تطبیق میں آج بھی رہ نمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

انسانی وسائل کو پیغمبر آخر الزماں ﷺ نے اپنے اوج کمال پر پہنچایا۔ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا ۔ (المائدہ:۳) سے قطعی طور پر واضح ہوتا ہے کہ انسانی وسائل کی افزائش وصرف کے اصول وضوابط اور طریقۂ کار بھی انسانوں کو بتا دیے گئے تھے۔ اصحاب صفہ کے ذریعہ علوم ومعارف میں مہارت اور توسیع دراصل مفسرین، محدثین، فقہاء اور خطباء کی تیاری، میدان جہاد کے لیے بہترین کمانڈر کی افزائش، تیر انداز، سیف زن، راستوں کی شناخت کرنے والے اور علم وفن میں ماہر خواتین کی خدمات اور ان کی حوصلہ افزائی وغیرہ وہ امور ہیں، جن کی مثالیں مکی اور مدنی زندگی میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

انسانی وسائل وذرائع معاصر عہد کا ایک قیمتی عنوان ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں، حکومتی ادارے، تعلیمی، تہذیبی و ثقافتی میدان، بین الاقوامی تعلقات، معاشی، سیاسی اور دینی تحریکات وغیرہ میں اس موضوع سے بھرپور استفادہ کیا جارہا ہے۔ تحریک اسلامی میں انسانی وسائل کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۹۷۹ء) نے ترجمان القرآن کے ذریعہ اور سید حسن البناء شہیدؒ (م ۱۹۴۹ء) نے عربی کتابچوں اور خطبات کے ذریعہ امت اسلامی کو انبیائی مشن کے لیے تیار کیا۔ بلاشبہ انسانی وسائل کو اسلامی رخ دینے اور انسانوں کے اندر حرکت وعمل پیدا کرنے میں امت کے دیگر مفکرین ومصلحت کی خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ لیکن قرآن وسنت کی روشنی میں انبیائی مشن اور وژن کو مذکورہ دونوں مفکرین نے نہ صرف علم وتحقیق کے ذریعہ آراستہ کیا، بلکہ بیسویں اور اکیسویں صدی میں اسے ایک ممکن العمل اور جدید ترین تقاضوں کی رعایت کرنے والا بنا دیا۔ آج یہ مشن اور یہ وژن غور وفکر کا موضوع اور کارِ جہاں آرائی کے لیے متبادل کے طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے۔

تقسیم ملک سے قبل غیر واضح سیاسی کشمکش کے زمانے میں امت اسلامی کے اندر سے ایک سنجیدہ طبقہ کو خلافت علی منہاج النبوۃ کے لیے یکجا و یکسو کرلینا سید مودودی کا عظیم کارنامہ ہے۔انھوں نے انسانوں کے انبوہ عظیم میں سے ایک قلیل تعداد کو اقامت دین کے لیے چن لیا۔جن کی اکثریت ایثار و قربانی کے جذبات سے سرشار تھی۔سالار کارواں نے اخلاقی تربیت کے لیے مؤثر کتابیں تصنیف کیں۔الگ سے تربیت وتزکیہ کا شعبہ قائم کیا۔ان کی صلاحیتوں کو ان کے مزاج ونفسیات کے مطابق کام میں لانے کے لیے علمی و تحقیقی، دعوتی و تربیتی اور خدمت خلق کے شعبے قائم کیے گئے۔قائدانہ صلاحیتوں کے فروغ کے لیے یہ سلسلہ ۱۹۳۸ء ہی سے شروع کر دیا گیا۔اس تعلیمی و تحقیقی ورک شاپ ''دارالاسلام'' کی ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ (۱۹۱۷۔۱۹۹۸ء) مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے فراغت کے بعد پٹھان کوٹ، ضلع گوداسپور [حال مشرقی پنجاب انڈیا] منتقل ہو گئے۔مولانا اگرچہ وہاں مستقل موجود نہیں رہ سکے، لیکن بھارت میں رہ کر بانی تحریک کے سب سے بڑے رمز شناس اور شارح وترجمان کہلائے۔روداد جماعت اسلامی کے متعدد جلدوں کے مطالعہ سے انسانی وسائل کے فروغ پر واضح رہنمائی ملتی ہے۔یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ افراد سازی اور قائدانہ صلاحیتوں کے فروغ کے لیے قیم جماعت میاں محمد طفیلؒ (۱۹۱۳۔۲۰۰۹ء) مولانا امین احسن اصلاحیؒ (۱۹۰۴۔۱۹۹۷) اور مولانا ابواللیث اصلاحی (۱۹۱۳۔۱۹۹۰) اور دیگر قائدین کا وژن بہت واضح تھا۔سلامتی کا راستہ، خطبات، رسالۂ دینیات اور تفہیم القرآن کا دنیا کی تمام معروف زبانوں میں منتقل کیا جانا دراصل انسانی وسائل کے فروغ کا علمی و تحقیقی کارنامہ ہے۔جس کے اثرات پر مولانا خلیل احمد حامدی نے اپنی کتاب تحریک اسلامی کے عالمی اثرات میں کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔روداد حصہ پنجم میں قیم جماعت میاں محمد طفیلؒ ۱۹۴۵ء تک کی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''صرف وہ افراد اور یونٹیں باقی رکھی جائیں جو اپنے مقصد میں مخلص ہوں۔جو صدیق اکبر اور خدیجہ الکبریٰ کی طرح اپنے سماج کے مخلص ہوں اور ان افراد کا رویہ منفعلانہ (Passive) نہ ہو بلکہ فاعلانہ (Active) ہو۔ارکان و کارکنان کے اندر غلامانہ ذہنیت کے بجائے داعیانہ جذبات کو فروغ دیا جائے جو انقلابی تحریک کے علم برداروں کے لیے اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔یہ جماعت اپنے ارکان و ہمدردوں کی اخلاقی صورت کا بروقت جائزہ لیتی رہتی ہے اور ارکان و ہمدردوں کی ایمانی قوت کا اندازہ زبانی دعووں سے نہیں بلکہ ان کے کام، جان و مال اور ایثار سے کیا جاتا ہے۔'' (روداد جماعت اسلامی، جلد سوم، اشاعت اپریل ۲۰۱۵، ص ۲۳)

۱۹۴۵ء تک جماعت اسلامی کے حلقۂ اثر کی بابت ابتدائی لٹریچر میں یہ بات کہی گئی کہ اس نے کروڑوں انسانوں تک اپنی دعوت دلائل وبراہان کے ساتھ پہنچادی۔چوں کہ دین اسلام کا غلبہ تمام ادیان وملل پر ہونا ہے، جس پر قرآنی آیات واحادیث کی واضح نظیریں موجود ہیں۔اسی لیے تمام انسانوں تک اللہ کے پیغام کو اس کی صحیح شکل میں پہنچانا اور اس کام کے لیے مردان کار تیار کرنا اس کی ترجیحات میں شامل ہے۔موصوف کہتے ہیں:

”.....ان سب مواقع پر ہماری یہ دعوت سب سلیم الفطرت لوگوں کے لیے فی الواقع ان کے اپنے دل کی آواز اور ایک جانی پہچانی لیکن بھولی ہوئی حقیقت معلوم ہوئی۔ بلکہ غیر مسلم حضرات میں سے بعض ایسے بھی ملے، جنہوں نے یہاں تک کہا کہ اے کاش! ہندوستان میں ہی اسلام پیش کیا گیا ہوتا اور مسلمان اس پر چلے ہوتے تو آج ہندوستان کا کچھ دوسرا ہی نقشہ ہوتا اور پھر انہوں نے ہمیں یہ بھی یقین دلایا کہ اگر آپ اپنی دعوت میں واقعی ثابت قدم رہے اور آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ صرف حق پرست ہیں اور آپ کی اس سے کوئی ذاتی یا قومی غرض نہیں ہے تو موجودہ مسلمانوں سے بڑھ کر اس میں غیر مسلم شریک ہوں گے۔ (حوالہ سابق، ص ۲۷)

ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ کی گفتگو کو تحریک اسلامی کی موجودہ پیش رفت کے حوالے سے مکمل کرنا چاہتا ہوں، جو اس نے Prism Model for HRD اور 3B Model for HRD کی اصطلاحات کے ذریعہ حاصل کرنے کی عملی جدوجہد شروع کر دی ہے۔ ان اصطلاحت کے ہر حرف کا ایک معقول معنی ہے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک اسلامی کو نئے لیڈرز اور قائدین فراہم کرنے کی یہ قابلِ تحسین علمی و عملی کوشش ہے۔ امید واثق ہے کہ انسانی وسائل کا مطلوبہ ہدف حاصل ہوگا۔ کوشش کی گئی ہے کہ مقامی، حلقہ اور مرکزی سطح پر انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعہ وژن اور مشن کا تعارف کرایا جائے۔ تا کہ اقامت دین کا قرآنی تصور عملی جامہ پہن سکے۔ ان اصطلاحات کے ذریعہ منصوبہ بندی، ریسرچ و تحقیق، حوصلہ مندی و اقدامی کیفیت، باہمی نصرت و معاونت اور احتساب و نگہداشت کے ذریعہ پوری تحریک میں یکساں حرکیت کا نشو و نما ہو سکے۔ افراد تحریک کا ہمہ جہتی ارتقاء، اس کام کے لیے استفادہ اور پھر صلاحیتوں کے فروغ کے لیے صلاحیتوں کو خریدنے سے بھی دریغ نہ کرنا، وہ چند رہنما خطوط ہیں، جن کے ذریعہ موجودہ قیادت سرگرم عمل ہے۔ اس کے پاس بھارت کے تکثیری سماج کے لیے ایک روڈ میپ ہے۔

سطور بالا میں انسانی وسائل کی اہمیت و ضرورت کے حوالے سے چند باتیں پیش کی گئی ہیں۔ فرد و معاشرے کی اپنی رہنمائی تحریک اسلامی کا ہدف ہے۔ جامعۃ الفلاح کا قیام بھی اسی ہدف کا ایک مبارک حصہ ہے۔ ابنائے جامعۃ الفلاح کی انجمن طلبۂ قدیم انسانی وسائل کا ’سونا اور چاندی‘ ہے۔ امید واثق ہے کہ ہر عالم و فاضل اپنی اہمیت کا ادراک و شعور حاصل کرے گا اور اپنی صلاحیتوں (امانت) سے جامعہ اور انجمن کو سیراب کرے گا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
۲۰ راگست ۲۰۲۱ء/۱۱رمحرم الحرام ۱۴۴۳ھ

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر [۴۱]

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحیؒ کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی

سورۂ الفتح کے بعض مقامات کا ترجمہ

(169) فتحاً قریباً سے مراد

سورۃ الفتح میں ایک بار فتحا مبینا اور دو بار فتحا قریبا آیا ہے، عام طور سے لوگوں نے اس فتح سے صلح حدیبیہ کو مراد لیا ہے، مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ تینوں جگہ فتح مکہ مراد ہے۔ فتحا قریبا کا مطلب وہ فتح نہیں ہے جو حاصل ہوگئی ہے، بلکہ وہ فتح ہے جو قریب ہے یعنی جلد ہی حاصل ہوگی۔ رہی صلح حدیبیہ تو وہ فتح نہیں بلکہ فتح مکہ کا پیش خیمہ تھی۔ اس وضاحت کی رو سے آیت نمبر (۱)، آیت نمبر (۱۸) اور آیت نمبر (۲۷) تینوں آیتوں میں فتح مکہ کی بشارت دی گئی ہے۔

وأثابهم فتحا قريبا (۱۸) کا ایک ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

”اور ان کو ایک لگے ہاتھ فتح دے دی“ (اشرف علی تھانوی)

جب کہ دوسرا ترجمہ یہ ہے:

”اور ان کو فتح دی جو قریب ہے“ (امانت اللہ اصلاحی)

دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے ترجمے کے مطابق صلح حدیبیہ ہی فتح ہے جو مل چکی ہے، دوسرے ترجمے کے مطابق فتح کی بشارت صلح حدیبیہ کے موقع پر مل گئی ہے، لیکن فتح جلد ہی ملنے والی ہے۔ یعنی صلح حدیبیہ فتح مکہ کا پیش خیمہ ہے، اور فتح مکہ اب قریب ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل ایمان کو سب سے زیادہ انتظار فتح مکہ کا تھا، باقی تو سب درمیانی مرحلے تھے۔

(۱۷۰) هذه اور أخرى کا ترجمہ

وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنكُمْ

وَلِتَكُونَ آيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا. وَأُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا. (الفتح:۲۰-۲۱)

آیت نمبر (۲۰) میں **فعجل لکم هذه** کا ترجمہ کرتے ہوئے لوگوں نے ھذہ کا ترجمہ فتح یا غنیمت کیا ہے، جب کہ یہ دونوں باتیں مراد لینا درست نہیں ہے، فتح اس وقت تک ہوئی نہیں تھی، اور غنیمت کا بھی وعدہ ہوا تھا، ابھی ملی نہیں تھی۔ **ھــذہ** کا ترجمہ تو ’’یہ‘‘ ہوگا، اور اس سے مراد صلح ہے۔ آیت نمبر (۲۱) میں اُخری کا ترجمہ بہت سے لوگوں نے غنیمتیں کیا ہے، یہ بھی درست نہیں ہے، اس کا ترجمہ ’دوسری چیز‘ ہوگا اور اس سے مراد فتح مکہ ہے۔ کیوں کہ جس سیاق میں اور جس اہتمام سے اس کا تذکرہ ہے اس سے فتح مکہ مراد لینا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد درج ذیل ترجمے ملاحظہ فرمائیں:

’’اللہ تم سے بکثرت اموال غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیے، تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔ اِس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی تک قادر نہیں ہوئے ہو اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘ (سید مودودی)

’’خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے سو اس نے غنیمت کی تمہارے لئے جلدی فرمائی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے۔ غرض یہ تھی کہ یہ مومنوں کے لئے (خدا کی) قدرت کا نمونہ ہو اور وہ تم کو سیدھے رستے پر چلائے، اور اَور (غنیمتیں دیں) جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (اور) وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے‘‘ (فتح محمد جالندھری)

’’اللہ تعالٰی نے تم سے بہت ساری غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے پس یہ تو تمہیں جلدی ہی عطا فرما دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے، تاکہ مومنوں کے لئے یہ ایک نشانی ہو جائے اور (تاکہ) وہ تمہیں سیدھی راہ چلائے۔ اور تمہیں اور (غنیمتیں) بھی دے جن پر اب تک تم نے قابو نہیں پایا۔ اللہ تعالٰی نے انہیں اپنے قابو میں رکھا ہے اور اللہ تعالٰی ہر چیز پر قادر ہے‘‘ (محمد جونا گڑھی)

’’وعدہ کیا ہے بہت سی غنیمتوں کا کہ تم لو گے تو تمہیں یہ جلد عطا فرما دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے اور اس لیے کہ ایمان والوں کے لیے نشانی ہو اور تمہیں سیدھی راہ دکھائے۔ اور ایک اور جو تمہارے بل (بس) کی نہ تھی وہ اللہ کے قبضہ میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے‘‘ (احمد رضا خان)

آخری ترجمے میں مذکورہ غلطیاں نہیں ہیں۔

شاہ عبدالقادر نے درج ذیل ترجمے میں اُخری سے فتح مرادلیا ہے،اور یہ درست ہے۔

''اور ایک فتح اور جو تمہارے بس میں نہ آئی وہ اللہ کے قابو میں ہے''

(۱۷۱)أظفر کم علیهم کا ترجمه

درج ذیل آیت میں أظفر کم علیهم کا ترجمہ عام طور سے فتح یاب کرنااور غلبہ عطا کرنا کیا گیا ہے، اس سے آیت کا مفہوم سمجھنے میں کافی دشواری پیش آتی ہے، بعض لوگ اس غلبے سے ایک چھوٹی سی مہم کی طرف اشارہ مراد لیتے ہیں، اور بعض لوگ فتح مکہ مراد لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ لیکن ان دونوں ہی تاویلوں سے آیت کا مفہوم واضح ہو کر سامنے نہیں آتا ہے، اور آیت اپنے سیاق سے ہم آہنگ بھی نہیں لگتی ہے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ یہاں أظفر کم علیهم کا ترجمہ ہے انہیں تمہارے بس میں کردیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے بس میں اور تمہاری زد میں تھے، اگر جنگ ہوتی تو دشمن بھاگ کھڑا ہوتا اور تمہاری فتح یقینی تھی، اس کے باوجود اللہ نے جنگ سے دونوں کو روک دیا۔ ظفر کا اصل مطلب ناخن ہے، اور جب شکاری پرندہ اپنے ناخنوں سے شکار کو گرفت میں لے لیتا ہے، تو اس کے لئے اس تعبیر کا استعمال ہوتا ہے۔ گویا اس لفظ میں گرفت میں لینا اور قابو میں کرلینا شامل ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: والظفر، الفوز. وأصله من ظفر علیه أي نشب ظفره فیه۔ (المفردات، راغب اصفہانی)

اس مفہوم کو اختیار کرنے سے آیت پورے سیاق سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے، اور آیت کا مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے، کسی طرح کا تکلف نہیں رہ جاتا ہے۔ اس وضاحت کی رو سے ذیل کے ترجموں میں آخری ترجمہ درست ہے۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ. (الفتح:۲۴)

''وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے روک دیے، حالانکہ وہ اُن پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا'' (سید مودودی)

''اور وہی تو ہے جس نے تم کو ان (کافروں) پر فتحیاب کرنے کے بعد سرحد مکہ میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے'' (فتح محمد جالندھری)

''وہی ہے جس نے خاص مکہ میں کافروں کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے روک لیا

اس کے بعد کہ اس نے تمہیں ان پر غلبہ دے دیا تھا'' (محمد جونا گڑھی)

''اور وہی ہے جس نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے وادی مکہ میں بعد اس کے کہ تمہیں ان پر قابو دے دیا تھا'' (احمد رضا خان)

''اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ان کے ہاتھ تم سے (یعنی تمہارے قتل سے) اور تمہارے ہاتھ ان (کے قتل سے) عین مکہ (کے قریب) میں روک دئے بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا'' (اشرف علی تھانوی)

آخری دونوں ترجموں میں أظفر کم علیھم کا مناسب ترجمہ کیا گیا ہے۔

(۱۷۲) لم تعلموھم کا تعلق کس سے؟

ذیل کی آیت میں لم تعلموھم کا تعلق رجال سے ہے، یعنی مکہ میں موجود مومن مرد اور مومن عورتوں کو تم لوگ نہیں جانتے ہو۔ نہ کہ أَنْ تَطَئُوهُم سے۔ اور بغیر علم کا تعلق فتصیبکم سے ہے۔ اس لئے یہ ترجمہ کرنا کہ تم لاعلمی میں ان کو کچل دو گے، درست نہیں ہے۔ کچلنے کا عمل لاعلمی میں نہیں ہوگا، البتہ اس کچلنے کے عمل سے جو عار لاحق ہوگا وہ لاعلمی میں لاحق ہوگا، کیوں کہ اہل ایمان ان مومن مردوں اور مومن عورتوں سے واقف نہیں تھے جو دل میں ایمان لائے ہوئے تھے۔

حاصل کلام یہ ہے أَنْ تَطَئُوهُم یعنی کچلنے کے عمل کا تعلق لاعلمی سے نہیں ہے۔

اس روشنی میں ذیل میں درج ترجمے دیکھیں:

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُؤْمِنَاتٌ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُمْ مِنْهُمْ مَعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا. (الفتح:۲۵)

''اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے، اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی روکی وہ اس لیے گئی) تا کہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں سے) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے'' (سید مودودی)

''اور اگر ایسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں نہ ہوتے جن کو تم لاعلمی میں روند ڈالتے، پس ان کے باعث تم پر لاعلمی میں الزام آتا (تو ہم جنگ کی اجازت دے دیتے۔ لیکن اللہ نے یہ اجازت اس لئے نہ دی) کہ جن کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اور اگر وہ لوگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ان لوگوں کو ان میں سے دردناک عذاب دیتے جنھوں نے کفر کیا'' (امین احسن اصلاحی)

''اور اگر صاحبِ ایمان مرد اور باایمان عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم نہیں جانتے تھے اور نادانستگی میں انہیں بھی پامال کر ڈالنے کا خطرہ تھا اور اس طرح تمہیں لاعلمی کی وجہ سے نقصان پہنچ جاتا تو تمہیں روکا بھی نہ جاتا - روکا اس لئے تا کہ خدا جسے چاہے اسے اپنی رحمت میں داخل کرلے کہ یہ لوگ الگ ہوجاتے تو ہم کفّار کو دردناک عذاب میں مبتلا کردیتے'' (جوادی)

اوپر کے تینوں ترجموں میں مذکورہ غلطی پائی جاتی ہے۔ جب کہ ذیل کے ترجموں میں یہ غلطی نہیں ہے۔

''اور اگر ایسے مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم جانتے نہ تھے کہ اگر تم ان کو پامال کردیتے تو تم کو ان کی طرف سے بے خبری میں نقصان پہنچ جاتا۔ (تو بھی تمہارے ہاتھ سے فتح ہوجاتی مگر تاخیر) اس لئے (ہوئی) کہ خدا اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرلے۔ اور اگر دونوں فریق الگ الگ ہوجاتے تو جو ان میں کافر تھے ان کو ہم دکھ دینے والا عذاب دیتے'' (فتح محمد جالندھری)

''اور اگر ایسے (بہت سے) مسلمان مرد اور (بہت سی) مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کی تم کو خبر نہ تھی یعنی ان کے پس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں ضرر پہنچتا، (تو تمہیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا) تا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے اور اگر یہ الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے ہم ان کو دردناک سزا دیتے'' (محمد جوناگڑھی)

''اور اگر یہ نہ ہوتا کچھ مسلمان مرد اور کچھ مسلمان عورتیں جن کی تمہیں خبر نہیں کہیں تم انہیں روند ڈالو تو تمہیں ان کی طرف سے انجانی میں کوئی مکروہ پہنچے تو ہم تمہیں ان کی قتال کی اجازت دیتے ان کا یہ بچاؤ اس لیے ہے کہ اللہ اپنی رحمت میں داخل کرے جسے چاہے، اگر وہ جدا ہوجاتے تو ہم ضرور ان میں کے کافروں کو دردناک عذاب دیتے'' (احمد رضا خان)

(۱۷۳) معرة کا ترجمه

مذکورہ بالا ترجموں میں لفظ معرة کا ترجمہ زیادہ تر نقصان، ضرر اور مکروہ کیا گیا ہے، معرة دراصل عرة سے ہے جس کے معنی خارش کے ہیں۔ لفظ کی اصل اور قرآن میں اس لفظ کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ معرة کا مطلب وہ ضرر یا نقصان ہے جو عزت کو داغ دار کرنے والا ہو۔

ماہر لغت علامہ جوہری لکھتے ہیں: **وفلان عُـرَّةٌ وعَارورٌ وعَارورةٌ، أى قَذِر. وهـو يَعُرُّ قومه، أي يـدخـل عـليهـم مكروهاً يلطخهم به۔** (الصحاح) گویا اس لفظ کے اندر گندگی کا اور دامن کو داغ دار کرنے کا مفہوم ہے۔

اس لیے یہاں عار پہونچنے کا ترجمہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ زیر نظر آیت کا درج ذیل ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''اور اگر ایسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں نہ ہوتے جن کو تم نہیں جانتے تھے، تم انہیں روند ڈالتے تو تم کو لاعلمی میں عار لاحق ہو جاتا ان کی وجہ سے، اللہ کو اپنی رحمت میں داخل کرنا تھا جسے وہ چاہے، اگر وہ لوگ الگ ہوتے تو ہم ان لوگوں کو دردناک عذاب دیتے جنھوں نے کفر کیا'' (امانت اللہ اصلاحی)

آیت (۲۷) کا ترجمہ

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا. (الفتح:۲۷)

(۱۷۴) بالحق کا ترجمہ

اس آیت میں پہلا قابل غور مقام ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَق

اس کا ترجمہ حسب ذیل کیا گیا ہے:

''اللہ نے سچ دکھایا اپنے رسول کو خواب'' (شاہ عبدالقادر)

''تحقیق سچ دکھلایا اللہ نے رسول اپنے کو خواب ساتھ سچ کے (شاہ رفیع الدین)

''فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا'' (سید مودودی)

''بیشک اللہ نے سچ کر دیا اپنے رسول کا سچا خواب'' (احمد رضا خان)

''بے شک خدا نے اپنے پیغمبر کو سچا (اور) صحیح خواب دکھایا'' (فتح محمد جالندھری)

''اللہ نے اپنے رسول کو مبنی بر حقیقت رؤیا دکھائی'' (امین احسن اصلاحی)

اس جملے میں صدق بھی ہے اور بالحق بھی ہے، عام طور سے ایسا ترجمہ نہیں کیا جا سکا، جس سے دونوں لفظوں کا حق ادا ہو سکے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ یہاں بالحق کا مطلب ہے خاص مقصد سے، قرآن کے اور بہت سے مقامات پر یہ لفظ اس مفہوم میں بہت واضح طور سے آیا ہے، جیسے:

مَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَق. (الأحقاف:۳)

''ہم نے آسمانوں اور زمین کو نہیں پیدا کیا ہے مگر ایک خاص مقصد سے۔''

اس طرح زیر غور مقام کا ترجمہ ہوگا: ''اللہ نے اپنے رسول کو ایک خاص مقصد سے سچا خواب دکھایا''۔

اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ صدق کا ترجمہ بھی ہوگیا اور بالحق کا ترجمہ بھی ہوگیا، دونوں کی الگ الگ معنویت بھی واضح ہوگئی، اور کسی قسم کا اشکال باقی نہیں رہا، اس طرح آیت کی بھرپور ترجمانی ہوگئی۔

(۱۷۵) فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِکَ فَتْحًا قَرِیبًا کا ترجمہ

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جعل کا ترجمہ کیا ہو۔ عام طور سے لوگوں نے عطا کرنے اور نوازنے کا ترجمہ کیا گیا ہے، جعل کا مطلب رکھنا اور مقرر کردینا لفظ سے زیادہ قریب ہے۔

اس سلسلے میں غور طلب امر یہ ہے کہ اس خواب سے مراد مکہ میں کون سا داخلہ مراد ہے۔ اگر صلح حدیبیہ کے بعد والا عمرہ مراد لیا جائے تو اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عمرے میں تو مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے کے بعد گویا وہاں سے نکل کر بال کٹوائے جاتے ہیں، نا کہ سر منڈائے اور بال ترشوائے داخل ہوتے ہیں، ایسا تو حج میں ہوتا ہے، کہ حج کے بعد قربانی کرکے اور سر منڈوا کر مسجد حرام میں طواف کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ اس بنا پر مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ خواب کا یہ وعدہ حجۃ الوداع میں پورا ہوا۔

وہ مذکورہ جملے کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''اس سے پہلے ایک فتح رکھ دی جو قریب ہے''۔ یعنی خواب کی تعبیر سامنے آنے سے پہلے یعنی حجۃ الوداع سے پہلے ہی فتح مکہ کا ہونا مقرر فرمادیا۔

درج ذیل ترجمے ملاحظہ ہوں:

''اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اُس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرمادی'' (سید مودودی، خواب پورا ہونے سے پہلے کیسے؟)

''تو اس سے پہلے اس نے تمہیں ایک فتح قریب سے نوازا'' (امین احسن اصلاحی)

''سو اس نے اس سے پہلے ہی جلد فتح کرادی'' (فتح محمد جالندھری)

''پھر اس سے پہلے لگتے ہاتھ ایک فتح دے دی'' (اشرف علی تھانوی)

''پھر ٹھیرادی اس سے پرے ایک فتح نزدیک'' (شاہ عبدالقادر)

''تو اس سے پہلے ایک نزدیک آنے والی فتح رکھی'' (احمد رضا خان)

آخری دونوں ترجمے مناسب ہیں۔ دراصل فتح قریب سے صلح حدیبیہ مراد لینے کی وجہ سے لوگوں کو اس

سیاق کی آیتوں کو سمجھنے میں دشواری ہوئی ہے۔

(۱۷۶)''ثم یعودون لما قالوا'' کا ترجمہ:

قرآن مجید میں سورۃ المجادلۃ میں ایک جگہ ظہار کے بیان میں **ثم یعودون لما قالوا** آیا ہے، اور اسی سورت میں ایک دوسری جگہ **ثم یعودون لما نهوا عنه** آیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ دونوں باتیں ایک ہی اسلوب کلام میں کہی گئی ہیں اور اس کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو دونوں کا ایک ہی طرح سے مفہوم سمجھا جائے۔

ثم یعودون لما قالوا کا مفہوم متعین کرنے میں مفسرین میں بہت زیادہ اختلاف ہوا ہے، جب کہ **ثم یعودون لما نهوا عنه** کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اول الذکر مقام کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین نہ تو دوسرے مقام کا حوالہ دیتے ہیں، اور نہ ہی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

ثم یعودون لما نهوا عنه کا مطلب اگر یہ ہے کہ جس بات سے روکا گیا تھا وہی بات دوبارہ کریں، تو **ثم یعودون لما قالوا** کا صاف مطلب ہے کہ جس بات کو وہ کہتے ہیں، یا کہتے رہے ہیں اسے دوبارہ کہیں۔

دور قدیم میں بعض لوگوں نے دوبارہ کہنے کا بالکل حرفی مفہوم اختیار کیا کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اگر کسی نے ایک بار کہا تو اس پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوگا، اور یہ حکم ہمیشہ دوسری بار کہنے کی صورت میں ہی لاگو ہوگا۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے، اور نہ اس طرح کی تعلیم کی کوئی اور نظیر قرآن مجید میں ہے کہ ایک بار کرنے پر کچھ نہیں اور دوبارہ کرنے پر سزا یا کفارہ۔

دراصل اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اب تک اس حرکت کا ارتکاب کرتے رہے ہیں، اب وہ اللہ کی طرف سے ممانعت سن کر باز آجائیں، اور اگر اس ممانعت کے بعد بھی انہوں نے ظہار کی وہ بات کہی جو اب تک کہتے رہے ہیں، تو پھر ان پر یہ حکم لاگو ہوگا۔ گویا اس آیت کے نزول کے بعد جو بھی ظہار کا مرتکب ہوگا، وہ **ثم یعودون لما قالوا** کے دائرے میں آجائے گا، اور اس پر مذکورہ کفارہ واجب ہوجائے گا۔ خواہ یہ کہنا پہلی بار ہو یا دوسری بار۔

مفسرین ومترجمین نے زیر نظر جملے کا مفہوم دو طرح سے بیان کیا ہے، ایک یہ کہ ظہار کرنے کے بعد اپنے ظہار سے رجوع کریں، اور دوسرے یہ کہ ظہار کرنے کے بعد اس کام کی طرف پلٹیں جسے انہوں نے ظہار کے ذریعہ خود پر حرام کیا ہے، یعنی بیوی سے تعلق۔ دونوں کا مقصود ایک ہے اور وہ یہ کہ ظہار کا کفارہ اس وقت لازم آتا ہے جب وہ ظہار کرنے کے بعد ظہار سے رجوع کرکے اپنی بیوی سے تعلق بحال کرنا چاہیں۔

اس مشہور رائے میں ایک اشکال تو لفظی ہے اور وہ یہ کہ **ثم یعودون لما قالوا** کی ظاہری عبارت سے یہ مفہوم نہیں نکلتا ہے، اور اس کے لیے پر تکلف تاویلیں کرنی پڑتی ہیں۔ مثلا یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں فعل ارادہ فعل کے معنی میں ہے، یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ یہاں لام عن کے معنی میں ہے، یا یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں **لما قالوا** کا مطلب **لما حرموا** ہے۔

جب کہ اگر تاویل کا یہ بلا سبب تکلف نہ کیا جائے، تو مفہوم بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے، یعنی ظہار والی بات کو دوبارہ کہنا۔ ظہار ایک قول ہے، اور یہاں اسی قول کو دوبارہ کہنے کی بات ہے۔

مشہور رائے میں ایک دوسرا معنوی اشکال بھی ہے اور وہ یہ کہ کفارہ تو اصل ظہار والی حرکت پر ہونا چاہیے، نہ کہ ظہار سے رجوع کرنے پر۔ اللہ تعالی نے ظہار سے رجوع کرنے کی مذمت نہیں کی ہے، بلکہ ظہار کرنے ہی کو منکر اور زور قرار دیا ہے، اور اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے سزا تو ہر اس شخص کو ملنی چاہیے جس نے اپنی ماں والے رشتے کی بے حرمتی کی، نہ کہ صرف اسے سزا ملے جو اس حرکت کو کرنے کے بعد اس سے توبہ کرے اور رجوع کرے۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد ظہار سے متعلق دونوں آیتوں کا معروف ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

الَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنكُمْ مِنْ نِسَائِهِمْ مَا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ إِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنْكَرًا مِنَ الْقَوْلِ وَزُورًا وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُور. وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّا ذَلِكُمْ تُوعَظُونَ بِهِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ. (المجادلة:۲۔۳)

''تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے، جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اُس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی، تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اِس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔ (سید مودودی)

زیر بحث مقام کے مزید ترجمے ملاحظہ ہوں:

''اور جو ماں کہہ بیٹھیں اپنی عورتوں کو پھر وہی کام چاہیں جس کو کہا ہے''۔ (شاہ عبدالقادر)

''اور وہ جو اپنی بیبیوں کو اپنی ماں کی جگہ کہیں پھر وہی کرنا چاہیں جس پر اتنی بری بات کہہ چکے''۔(احمد رضا خان)

''اور جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں کہہ بیٹھیں پھر اپنے قول سے رجوع کر لیں''۔(فتح محمد جالندھری)

''جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کر لیں''۔(محمد جونا گڑھی)

''اور جو لوگ اپنی بیبیوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنی کہی ہوئی بات کی تلافی کرنا چاہتے ہیں''۔ (اشرف علی تھانوی)

جب کہ مولانا امانت اللہ اصلاحی اس جملے کا حسب ذیل ترجمہ تجویز کرتے ہیں:

''جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے رہے ہیں، پھر وہی بات کہیں''۔

یہ ترجمہ ویسا ہی ہے جیسا ترجمہ درج ذیل آیت کا کیا گیا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَى ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ. (المجادلۃ:۸)

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ جنہیں کانا پھوسی سے روک دیا گیا تھا وہ پھر بھی اس روکے ہوئے کام کو دوبارہ کرتے ہیں''۔(محمد جونا گڑھی)

''کیا تم نے انہیں نہ دیکھا جنہیں بری مشورت سے منع فرمایا گیا تھا پھر وہی کرتے ہیں جس کی ممانعت ہوئی تھی''۔(احمد رضا خان)

''کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جنہیں سرگوشیاں کرنے سے منع کر دیا گیا تھا پھر بھی وہ وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا؟''۔(سید مودودی)

اس آیت کے علاوہ دو مقامات اور ہیں جہاں عاد لام کے صلے کے ساتھ آیا ہے، اور ان دونوں مقامات پر بھی کسی کام کو پھر سے کرنے کا مفہوم ہے۔

وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ. (الأنعام:۲۸)

''اور اگر یہ لوٹائے جائیں گے تو وہی کریں گے جس سے روکے گئے''۔(امین احسن اصلاحی)

يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَنْ تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَدًا. (النور:۱۷)

''اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو ایسی بات تم سے پھر کبھی صادر نہ ہو''۔(امین احسن اصلاحی)

مذکورہ بالا حوالوں کے علاوہ مزید یہ بات بھی ہے کہ قرآن مجید میں فعل عاد کا استعمال مختلف صیغوں سے کئی مقامات پر ہوا ہے، اور کہیں بھی کسی کام سے رجوع کرنے کے مفہوم میں نہیں ہے۔

اس مفہوم کی رو سے ظہار کا کفارہ صرف ظہار کے بعد بیوی کی طرف پلٹنے سے واجب نہیں ہوتا ہے، بلکہ ظہار کرنے سے ہی کفارہ واجب ہوجاتا ہے، البتہ اس کی انجام دہی موخر نہیں کی جاسکتی ہے، اس کی انجام دہی جلد ضروری ہے، اس لیے شوہر اور بیوی کے باہمی تعلق سے پہلے اسے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ظہار کی وجہ سے شوہر اور بیوی علیحدہ نہیں ہوجاتے۔ یعنی اگر ظہار کے بعد شوہر مر گیا تو شوہر کے ترکے میں بیوی کا حصہ رہے گا۔

مزید برآں، اس مفہوم کی رو سے اگر ظہار کے بعد کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے، تو بھی ظہار کا کفارہ اس پر واجب رہے گا، اور وہ طلاق دے کر کفارے سے بری الذمہ نہیں ہوجائے گا۔

یہ وضاحت بھی مفید ہوگی کہ ظہار اور ایلاء کا حکم اس معنی میں ایک ہے کہ ظہار کے بعد عورت ہمیشہ کے لیے معلق نہیں رہے گی، بلکہ اگر چار ماہ کے اندر شوہر نے رجوع نہیں کیا تو وہ اس سے از خود الگ ہوجائے گی۔

البتہ ظہار کی صورت میں شوہر پر وہ کفارہ لازم آئے گا، جو ایلاء کی صورت میں لازم نہیں آئے گا۔

ممکن ہے مفسرین نے یہ مفہوم اس لیے نہیں اختیار کیا ہو کہ کفارہ کے ساتھ **من قبل أن يتماسا** کی شرط لگی ہوئی ہے، (جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر بھی کیا ہے) اور اس کا تعلق تو صرف رجوع کی صورت سے ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفارے کا وجوب تو ظہار ہی کی وجہ سے ہوجاتا ہے، مگر اس کی انجام دہی جلدی ہو، اور ایسا نہ ہو کہ کفارے کی انجام دہی کے بغیر ازدواجی زندگی معمول کے مطابق گزرنے لگے، اس کے لیے یہ شرط لگا دی گئی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کفارہ رجوع کو مشکل بنانے کے لیے نہیں ہے، بلکہ ظہار کے غلط طریقے پر روک لگانے کے لیے ہے۔

(۱۷۷) لعل برائے علت

لعل عام طور سے توقع یعنی اچھی امید یا ناخواہی اندیشے کا مفہوم ادا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ البتہ کیا وہ تعلیل کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے؟ اس امر میں اختلاف ہے۔ ابن ھشام کے الفاظ ہیں: **الثانی التعليل أثبته جماعة منهم الأخفش والكسائی وحملوا عليه (فقولا له قولا لينا لعله يتذكر أو يخشى) ومن لم يثبت ذلک يحمله على الرجاء ويصرفه للمخاطبين أى اذهبا على رجائكما .(مغنی اللبيب)**

تاہم قرآن مجید کے بعض مواقع پر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں لعل تعلیل کے لیے ہی ہے، اور اگر تعلیل کے بجائے توقع کا ترجمہ کریں، تو بات غیر موزوں سی لگتی ہے، اور اس کی پر تکلف تاویل کرنی پڑتی ہے۔ ذیل کی کچھ مثالوں میں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے۔

(۱) يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ(یوسف:۴۶)

''اس نے جا کر کہا: یوسف، اے سراپا راستی مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی، شاید کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور شاید کہ وہ جان لیں''۔(سید مودودی)

''شاید میں لوگوں کی طرف لوٹ کر جاؤں شاید وہ آگاہ ہوں''۔(احمد رضا خان)

''شاید میں لوگوں کے پاس باخبر واپس جاؤں تو شاید انہیں بھی علم ہو جائے''۔(جوادی)

''کہ میں لے جاؤں لوگوں پاس شاید ان کو معلوم ہو''۔(شاہ عبدالقادر)

''تو کہ پھر جاؤں میں طرف لوگوں کے تو کہ وہ جانیں''۔(شاہ رفیع الدین)

''تا کہ میں لوگوں کے پاس جاؤں تا کہ وہ بھی جانیں''۔(امین احسن اصلاحی)

آخری دونوں ترجمے تعلیل کے اعتبار سے کیے گئے ہیں، اور وہی موزوں لگتے ہیں۔ یہاں شاید کے ترجمہ کا کوئی محل نہیں ہے۔ وہ شخص تو آیا ہی اسی لیے تھا کہ خواب کی تعبیر معلوم کرے اور لوگوں کو واپس جا کر بتائے، تاکہ وہ لوگ تعبیر جان لیں۔ یہاں دونوں ہی لعل تعلیل کے لیے ہیں، توقع اور شاید کا کوئی محل ہی نہیں ہے۔ مفسرین نے یہاں توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے اپنی واپسی کا یقین نہیں تھا، لیکن یہ پرتکلف بات ہے۔

(۲) حَتَّى إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ. لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ. (المومنون:۹۹۔۱۰۰)

''(یہ لوگ اپنی کرنی سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ "اے میرے رب، مجھے اُسی دنیا میں واپس بھیج دیجیے جسے میں چھوڑ آیا ہوں۔ امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا''۔(سید مودودی)

''یہاں تک کہ جب ان میں کسی کو موت آئے تو کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھے واپس پھیر دیجئے، شاید اب میں کچھ بھلائی کماؤں اس میں جو چھوڑ آیا ہوں''۔(احمد رضا خان)

''(یہ لوگ اسی طرح غفلت میں رہیں گے) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آجائے گی تو کہے گا کہ اے پروردگار! مجھے پھر (دنیا میں) واپس بھیج دے، تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں نیک کام

کیا کروں‘‘۔(فتح محمد جالندھری)

’’یہاں تک کہ جب ان میں کسی کو موت آنے لگتی ہے تو کہتا ہے اے میرے پروردگار! مجھے واپس لوٹا دے، کہ اپنی چھوڑی ہوئی دنیا میں جا کر نیک اعمال کرلوں‘‘۔(محمد جوناگڑھی)

آخری دونوں ترجمہ تعلیل کے اعتبار سے کیے گئے ہیں، یہاں بھی امید اور شاید کا محل نہیں ہے، کیونکہ جب کوئی اس دنیا میں واپسی کے لیے دعا کرے گا، تا کہ ملی ہوئی مہلت میں نیک اعمال کرے، تو وہ پختہ وعدے کی زبان استعمال کرے گا، نہ کہ توقع اور امید والے الفاظ استعمال کرے گا۔ شاید کا لفظ تو وعدے کو بے وزن کردیتا ہے۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ فیما ترکت کا تعلق أعمل صالحا سے ہے نہ کہ ارجعون سے ہے۔ یعنی جو میں نے چھوڑا ہے اس میں نیک عمل کروں، نہ یہ کہ مجھے وہاں (اس دنیا میں) لوٹا دیں جو میں چھوڑ آیا ہوں۔

مذکورہ بالا تمام پہلوؤں کے اعتبار سے درج ذیل ترجمہ موزوں ہے:

’’یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوگی تو وہ کہے گا کہ اے رب مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں نیکی کماؤں‘‘۔(امین احسن اصلاحی)

(۳) فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَى. (طہٰ:۱۳۰)

’’پس اے محمدؐ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ‘‘۔(سید مودودی)

’’اس امید پر کہ تم راضی ہو‘‘۔(احمد رضا خان)

’’بہت ممکن ہے کہ تو راضی ہو جائے‘‘۔(محمد جوناگڑھی)

’’تا کہ تم خوش ہو جاؤ‘‘۔(فتح محمد جالندھری)

’’تا کہ تم نہال ہو جاؤ‘‘۔(امین احسن اصلاحی)

یہاں بھی توقع اور امید کے بجائے تعلیل کا محل ہے۔ اللہ تعالی کی طرف سے خوشی اور رضا کے حصول کا یقینی طریقہ بتایا گیا ہے۔

●◘●

عائلی نظامِ زندگی پر مغربی تہذیب وثقافت کے اثرات

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

ڈاکٹر محمد اسامہ

امتِ مسلمہ کو درپیش خطرات میں سے ایک بڑا خطرہ عائلی نظامِ زندگی پر مغربی تہذیب وثقافت کا غیر معمولی اثر انداز ہونا ہے۔اس تہذیب کو فروغ دینے کے ذرائع نہ صرف تیز، بلکہ پر کشش بھی ہیں، اس لیے مسلمانوں کی عائلی زندگی اس سے متاثر ہو رہی ہے اور انہیں ایک بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ موجودہ حالات میں اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ نسلِ انسانی پر مغربی تہذیب وثقافت کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں؟ مسلمانوں کے عائلی نظام کو اس سے کیا خطرات لاحق ہیں؟ نیز امتِ مسلمہ ان کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے؟ ان سوالات پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عائلی نظام زندگی سے کیا مراد ہے؟ اور اس کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟

عائلی نظام کی تعریف

جدید دور میں ’’عائلی نظام‘‘ کے لیے انگریزی زبان میں ’’پرسنل لا‘‘(Personal Law) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔اس میں خاندان، حسب ونسب، شادی، طلاق، حضانت، رضاعت، وصیت، ولایت، نان نفقہ، وقف اور میراث وغیرہ شامل ہیں۔اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے مصر کے مشہور فقیہ محمد قدری پاشا نے کیا۔[۲]

دنیا کی قیادت اس وقت یورپ کے ہاتھوں میں ہے، لہٰذا وہ نہ صرف سیاسی، معاشی اور عسکری لحاظ سے، بلکہ تہذیب وتمدن کے حوالے سے بھی پوری دنیا کو اپنے استبدادی نظام میں جکڑے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے سماجی اور تہذیبی اثرات اس وقت دنیا کے گوشے گوشے میں بہ آسانی محسوس کیے جا سکتے ہیں، البتہ اسے اگر کسی سے خطرہ ہے تو صرف ’اسلامی تہذیب‘ ہے، کیوں کہ صرف اسی کے بنیادی خدوخال ایسے ہیں جو مغربی تہذیب کے خلاف مضبوط فکری مزاحمت رکھتے ہیں۔ نیز دونوں تہذیبوں کے درمیان عقائد اور افکار و نظریات کا بھی واضح فرق نظر آتا ہے۔بہتر ہوگا کہ دنیا کی دو مشہور تہذیبوں– اسلامی تہذیب اور مغربی

تہذیب- کا تقابلی جائزہ لیا جائے کیوں کہ اس وقت مقابلہ ان ہی کے درمیان ہے 3 اور عائلی نظام زندگی پر ان کے نمایاں اثرات مرتب ہورہے ہیں۔

اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں فرق

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو دونوں کے درمیان درج ذیل بنیادی فرق نظر آتا ہے:

اسلامی تہذیب کی بنیاد 'توحید' پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات میں پائی جانے والی اشیاء اور بذاتِ خود انسان بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تمام تر صلاحیتیں اللہ رب العالمین کی عطا کردہ ہیں جنہیں وہ اس کی مقرر کردہ حدود وقیود کے اندر ہی استعمال کرسکتا ہے اور اس سلسلے میں وہ وحی الٰہی کا نہ صرف محتاج ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ بھی ہے۔ اسلامی تہذیب کے افکار ونظریات کا مختصراً جائزہ لیا جائے تو اس کے نمایاں نکات حسب ذیل ہیں:

☆ تصورِ الٰہ

☆ مخصوص عقائد

☆ تصورِ انسان

☆ تصورِ کائنات

☆ تصورِ آخرت

مغربی تہذیب کی بنیاد 'مادیت' پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کسی بالاتر ہستی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ اس کے حاملین کا ماننا ہے کہ اخلاقی اصول وقوانین کا معیار انسانی عقل خود طے کرسکتی ہے، اس میں کسی مذہب یا وحی الٰہی کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ اخلاقی قوانین دراصل سماج کے پیدا کردہ ہیں۔ مغربی تہذیب کے افکار ونظریات کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل معروف نکات سامنے آتے ہیں:

☆ مذہب کو فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دیا گیا۔ (سیکولرزم)

☆ فرد کو مکمل طور سے آزادی دے کر خدا کے مقابلے میں مختارِ کل بنادیا گیا۔ (ہیومنزم)

☆ دنیاوی زندگی ہی کو کل سمجھتے ہوئے تمام امیدوں اور خواہشات کا مرکز سمجھا گیا اور اس کے حصول کے لیے تمام افعال کو جائز کردیا گیا، ایسے میں آخرت کے تصور کا خاتمہ ہوگیا۔ (میٹیریلزم)

☆ وحی الٰہی اور رسالت کے تصور کا انکار کرتے ہوئے عقل، مشاہدہ اور تجربہ کو ہی صحیح وغلط کا معیار سمجھا گیا۔ (امپیریسزم)

☆عورت کو آزادی کے نعروں کے جال میں پھنسا کر اسے جنسی اباحیت، فحاشی، عریانیت اور زنا کاری کا محور ومرکز سمجھا گیا۔(لبرلزم)

☆ ڈارون کے نظریہ 'انسان بھی جانوروں کی طرح حیوان ہے' کو فروغ دیا گیا، جس سے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے تصور کا خاتمہ ہو گیا۔(ڈارونزم)

☆ قانون بنانے کا حق انسان کو دے دیا گیا۔اب وہ جس چیز کو چاہے حرام کر دے اور جس چیز کو چاہے حلال کر دے۔(ڈیموکریسی)

☆ دنیاوی زندگی کو ہی کل سمجھا گیا، چناں چہ عیش پرستی کو اس کا لازمی جز کر دیا گیا اور اس کے لیے دولت کا حصول بہر صورت جائز کیا گیا، خواہ وہ جوئے، سود اور اسی قبیل کے دیگر ذرائع سے ہی کیوں نہ آئے۔(کیپٹل ازم)

ظاہر ہے کہ درج بالا دونوں نظریات میں مشرق ومغرب کا فرق ہے۔دونوں تہذیبوں کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کے برعکس اسلام اور مسلمانوں کی اپنی ایک الگ تہذیب وثقافت ہے اور یہ مغربی تہذیب کے بنیادی افکار ونظریات وعقائد سے کلیۃً متضاد ہے۔اس میں اعلیٰ اتھارٹی اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، جب کہ مغربی تہذیب میں یہ مقام انسانوں کو ہی ملا ہوا ہے اور مذہب یا وحی الٰہی کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔چناں چہ اس بنیادی فرق کی وجہ سے دونوں کے بنیادی افکار ونظریات میں بھی واضح فرق نظر آتا ہے۔مغربی تہذیب کے اس انحراف میں جہاں مذہبی بے زاری، صنعتی انقلاب، تعلیمی نظام، سائنس وٹکنالوجی میں غیر معمولی ترقی، ہمہ جہت آزادی کے تصور نے اہم کردار ادا کیا ہے وہیں بعض مغربی مفکرین بالخصوص ڈارون، کارل مارکس، اینگلز اور سگمنڈ فرائڈ(۱۸۵۹-۱۹۳۹ء) وغیرہ کا بھی ہاتھ رہا ہے۔

مغربی تہذیب میں عائلی نظام زندگی کی بنیاد اور نتائج

پچھلی گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی تہذیب میں انسان ہی اعلیٰ اتھارٹی پر قابض ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اصول وضوابط خود وہی اپنی عقل کی بنیاد پر طے کرے گا، مذہب اور وحی الٰہی کا اس میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ایسے میں ظاہر ہے کہ بشری کم زوری اور فطرت کے مطابق عائلی نظام زندگی کے جو اصول وضوابط اور قوانین دنیا کے سامنے پیش کیے گئے اس میں 'ذاتی مفاد' اور 'ذاتی لذت' کو نمایاں مقام دیا گیا، نیز اخلاقی اقدار کی بنیاد 'مادیت' پر رکھی گئی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں جہاں ایک طرف مادی

سہولتیں، آسانیاں اور مشینیں وجود میں آئیں وہیں دوسری طرف انسانی تہذیب اور وجودِ انسانی سے وابستہ رشتوں اور محبتوں کا خاتمہ ہوگیا۔قابلِ توجہ بات یہ بھی ہے کہ ان اصولوں کے تحت انسان خود کو اپنی ذات تک ہی محدود کرلیتا ہے چناں چہ وہ صرف اپنے لیے کمانا، خرچ کرنا اور عیش وآرام کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ان ہی اسباب سے نفسانی خواہش اور ذاتی مفاد پر مبنی یورپ کا عائلی نظام تباہ و برباد ہو چکا ہے چناں چہ اس میں روایتی کنبوں کا تصور ناپید ہورہا ہے، بغیر شادی کے اکٹھے رہنے کا تصور (Live in Relationship)، نیز اکیلے زندگی بسر کرنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔زوجین ایک دوسرے کے حقوق سے نابلد ہیں اور اگر واقف بھی ہیں تو ادا نہیں کرتے۔عورت گھر کی ذمہ داری سنبھالنے کو عار سمجھتی ہے۔شادی کے تناسب میں غیر معمولی کمی، طلاق کی شرح اور ناجائز بچوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔والدین کے پاس اولاد کے لیے اور اولاد کے پاس والدین کے لیے وقت نہیں ہے۔'اولڈ ایج ہوم' کا کلچر عام ہو چکا ہے۔اس افسوس ناک صورتِ حال پر پروفیسر ثریا بتول علوی نقد کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''عورت اور مرد دوش بدوش کام کررہے ہیں، مگر گھر اب خالی ہو گئے ہیں، بچے ماؤں سے ،شوہر بیویوں سے اور گھر گھر والیوں سے محروم ہو گئے ہیں۔بیمار اور بوڑھے کسی ہمدرد اور غم خوار کو ترس گئے ہیں۔خاندانی نظام مکمل طور پر تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔افراد خانہ کے اندر محبت والفت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور انسان سکون سے محروم ہو گیا، جو صرف خاندان ہی فراہم کرسکتا ہے۔خاندان کا ٹوٹنا دراصل پورے معاشرے کا درہم برہم ہونا ہے۔یہ اتنا بڑا خسارہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اسے زیادہ دن برداشت نہیں کرسکتا۔''4

خود مغرب عائلی نظام میں کیے ہوئے اپنے تجربات اور افکار ونظریات سے پریشان ہے، چناں چہ Richard G Wilkins, (1952-2012) اسلامی اور مغربی عائلی نظام کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''مادی وسائل اور سائنس وٹکنالوجی کے اعتبار سے ہم ترقی یافتہ اقوام ہیں اور آپ تیسری دنیا کے لوگ ہیں، مگر خاندانی نظام اور سماجی واخلاقی اقدار کے اعتبار سے مسلمان ترقی یافتہ اور ہم پس ماندہ ہیں۔عورت کو انسان سازی کے کام سے ہٹا کر اس عورت پر بھی بڑا ظلم ہوا اور ساتھ ہی معاشرے کے ساتھ بھی۔عورت اور بچے کا بہترین مفاد اسی میں ہے کہ شادی اور خاندان کے ادارے کی مضبوطی اور تقدس کی بحالی کی جائے۔خاندان اور شادی کا ادارہ ماں اور بچے کے لیے تحفظ کے بڑے بڑے ادارے ہیں۔مغربی معاشرے میں سب سے زیادہ مظلوم عورت اور بچہ ہیں۔ان سے عبرت حاصل کریں اور اپنے ممالک کو ان تجربات سے بچائیں۔''۵

اسلامی عائلی نظام زندگی پر مغربی تہذیب کے اثرات

دورِحاضر میں اہلِ مغرب کی ناقابل یقین ترقی اور جدید ٹکنالوجی کے ذریعے نت نئی ایجادات سے اقوامِ عالم بہت زیادہ متاثر ہوئی ہیں ،جس کی وجہ سے انہوں نے مغربی افکار ونظریات اور تہذیب وتمدن کو اختیار کرنے میں ہی اپنی کامیابی وکامرانی کا راز سمجھا۔عالمِ اسلام بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا اور مسلمانوں نے بھی خواہی نہ خواہی مغربی تہذیب وتمدن کے بہت سے افکار ونظریات کو اپنی زندگی کے نظامِ حیات میں شامل کرلیا ہے۔ان ہی میں سے ایک عمل امت مسلمہ کا عائلی نظام زندگی میں اس تہذیب سے متاثر ہونا ہے۔راقم الحروف نے طوالت کے پیشِ نظر اس مقالے میں ''عائلی نظام'' کے صرف ایک پہلو ''خاندان'' اوراس کے بنیادی عناصر (والدین ،نکاح ،زوجین ،اولاد اور طلاق) کو موضوعِ بحث بنایا ہے ،نیز ان پر مغربی تہذیب و ثقافت کے اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

خاندان

اسلام کے عائلی نظام میں خاندان کی اہمیت وافادیت پر خصوصی زور دیا گیا ہے، کیوں کہ یہ معاشرے کی سب سے اہم اور بنیادی اکائی ہے اوراس کی ترقی اور نشو ونما کا انحصار بھی بہت حد تک خاندانی استحکام پر منحصر ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں ایک تہائی احکام عائلی نظام زندگی سے متعلق ہیں۔اس کا مقصد جہاں ایک طرف نسلِ انسانی کو باقی رکھتے ہوئے اسے تحفظ فراہم کرنا ہے وہیں دوسری طرف ایسے افراد تیار کرنا بھی ہے جو ملک وملت کی تعمیر وترقی میں اپنا مثبت کردار ادا کرسکیں۔

اسلامی نظام میں خاندان کا وجود مرد اور عورت کے درمیان نکاح سے ہوتا ہے، پھراس میں ان کے بچے ،شوہر، والدین اور دیگر خونی رشتے دار بھی شامل ہوکر ایک وسیع خاندان کو تشکیل دیتے ہیں۔البتہ شوہر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیوی، بچوں کی کفالت ،نگہداشت اور تعلیم وتربیت کرے اوراسی بنیاد پر وہ گھر کا سربراہ ہوتا ہے ۔بیوی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر کو سنبھالے۔واضح رہے کہ مرد کی سربراہی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کا درجہ اسلام کی نظر میں کم تر یا کم زور ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس نے مرد وعورت دونوں کی سرگرمیوں کے دائرے متعین کردیے ہیں اوران کو ان ہی حدود میں رہ کر کام کرنا ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

الا، کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته،فالامام الذی علی الناس راع و هو مسئول عن رعیته،والرجل راع علی أهل بیته و هو مسئول عن رعیته،والمرأة

راعية علی أهل بيت زوجها و ولده و هی مسئولة عنهم.[6]

(تم میں سے ہر ایک نگراں ہے،اوراس سے،اس کے ماتحتوں سے متعلق سوال ہوگا۔پس حکم راں نگراں ہےاوراس سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔آدمی اپنے گھر والوں پر نگراں ہےاوراس سے اس کے زیردستوں کے بارے میں باز پرس کی جائے گی اورعورت اپنے شوہر کے گھراوراس کے بچوں کی نگراں ہے،اوراس سےان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔)

اسلام نے درج بالا مقاصد کے پیشِ نظر خاندان اور اس کے اہم جز (نکاح) کو بہت اہمیت دی ہے،البتہ اللہ تعالیٰ نے مؤخرالذکرکو لازمی اوراٹل حیثیت نہیں دی، بلکہ اس بات کی گنجائش رکھی کہ اگر زوجین کے درمیان تمام اصلاحی کوششوں کے باوجود بھی نباہ ہونا مشکل ہورہا ہےتو بھلے طریقے سے شریعت کے مطابق دونوں طلاق یا خلع کے ذریعہ علیٰحدہ ہوجائیں۔یہ پہلو بھی درحقیقت ایک انعامِ خداوندی ہے،البتہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بہ کراہت ہی اجازت دی ہےجیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما أحل الله شئياً أبغض اليه من الطلاق.[7]

(اللہ تعالیٰ نے طلاق سے زیادہ کسی ناپسندیدہ چیز کو حلال نہیں قرار دیا۔)

نظریۂ خاندان کے حوالے سے اگر مغربی تہذیب کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ یہاں خاندان ایک ایسا معاشرہ ہے جو ایک سول معاہدے سے وجود میں آتا ہے۔نیز یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کا وجود مرد اور عورت کے ذریعہ ہو،چناں چہ مغرب کے بعض ممالک میں یک جنس (Unisex) خاندان کا تصور بھی عام ہو چکا ہےاوراس کے مطابق مرد کے بغیر بھی خاندان بن سکتا ہے۔عالمی کنونشن ۱۹۷۹ء(سیڈا) کی سفارشات دومردوں کے اکٹھے رہنے،دوعورتوں کے اکٹھے رہنےاور بغیرنکاح کے ساتھ رہنے کو بھی خاندان کا نام دیتی ہیں۔مزید برآں کہا گیا کہ بچوں کی ضرورت کو جدید طبی وسائل سے پورا کیا جاسکتا ہے۔اس تصور سے ماں کی حیثیت اور مقام کا بھی خاتمہ ہوگیا۔چناں چہ اصول بنایا گیا کہ ماں کا کردار (Motherhood) حکومت اورمعاشرے کی اجتماعی ذمہ داری ہے،صرف عورت کے ساتھ ہی یہ کام مخصوص نہیں کیا جاسکتا۔اسی لیے مغرب میں مرد کو گھر کے سربراہ کی حیثیت سے تسلیم نہ کرتے ہوئے تمام عائلی قوانین میں عورت کو خودمختار بنایا جارہا ہے،جیسے بیٹی اپنے نکاح اورطلاق کا فیصلہ خود کرسکتی ہےاورولدیت میں اندراج باپ کے بجائے ماں کے نام سے کرسکتی ہے۔

مغربی مفکرین نے بھی اپنی تحریروں میں روایتی خاندان کے تصور کو نقد کا نشانہ بنایا ہے۔معروف مفکر Sir Edmund Ronald Leach, 1910-1989 نے کہا:

''خاندان اپنے افراد پر بہت زیادہ دباؤ ڈالتا ہے، جس کا نتیجہ تشویش اور ذہنی دباؤ کی صورت میں نکلتا ہے جو بیرونی دنیا کے متعلق دشمنی، خوف اور بدگمانی کو پروان چڑھاتے ہیں۔''۸؎

اسی طرح Linda Nicholson, ca1959 خاندان کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''متبادل کنبے روایتی خاندانوں کے مقابلے میں تعلقات کو زیادہ اہم اور مضبوط بناتے ہیں۔ یہ متبادل کنبے ہم جنس لونڈوں(Gays) اور ہم جنس عورتوں(Lesbians) کے جوڑوں سے لے کر بچوں اور بچوں کے بغیر صحبتوں اور مخلوط رہائشوں تک پائے جاتے ہیں۔''۹؎

خاندان کے تعلق سے درج بالا نظریات غیر فطری اور عقلِ سلیم کے بالکل خلاف ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس کے پس منظر میں انسانی عقل کام کررہی ہے اور مذہب یا وحی الٰہی کو کنارے کر دیا گیا ہے۔مغربی مفکرین نے ان افکار کے ذریعے خاندان کی بنیادی ساخت اور ڈھانچے کو نہ صرف بدل کر رکھ دیا، بلکہ انہیں مشرقی ممالک بالخصوص مسلم ممالک میں فروغ دینے کی ہر ممکن کوششیں کی ہیں۔خاندان کے مرکزی کردار 'عورت' کو کچھ اس طرح بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ جیسے صرف وہی اس وقت تباہ حال، ناخواندہ، بیمار اور مختلف مسائل کا شکار مخلوق ہے اور پھر اس کی آڑ میں اقوام متحدہ سمیت دیگر عالمی تنظیمیں عورتوں کے 'حقوق' اور 'ترقی' کے لیے دنیا بھر میں کانفرنسیں کررہی ہیں۔ چناں چہ اقوام متحدہ کی جانب سے 'بیجنگ پلس فائیو' (۵/جون ۲۰۰۰ء، بمقام نیویارک) کے خصوصی اجلاس میں جو بنیادی ہدف طے کیے گئے ان میں سے ایک مسلم معاشرے کے خاندانی نظام کو ختم کرنا بھی تھا۔حالاں کہ خود مغرب کو بھی اس سلسلے میں نقصان اٹھانا پڑا ہے اور اب ان کے یہاں سے خاندانی نظام کا لگ بھگ خاتمہ ہو چکا ہے۔اس کے مضر اثرات نمایاں طور سے مردوں، عورتوں اور بچوں پر پڑے ہیں اور ان میں سے اکثر ذہنی مریض بن چکے ہیں۔ان میں 'شیزوفینیا' (Schizophrenia) کی بیماری عام ہے، جو کم زور اور خراب خاندانی نظام ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ان حالات کی وجہ سے مغرب کل بجٹ کا 40% ذہنی صحت پر خرچ کرتا ہے۔

امتِ مسلمہ کی بدقسمتی یہ رہی کہ وہ مغربی تہذیب کی بنیادوں اور اس کے پرفریب نعروں کو سمجھ نہیں سکی اور اس کے مضر اثرات کو بھی قبول کرتی چلی گئی۔اس کا نقصان اسے اپنے عائلی نظام زندگی میں بھی اٹھانا پڑ رہا ہے۔ چناں چہ اب مسلمانوں کے خاندان بھی چھوٹے سے چھوٹے ہوتے چلے جا رہے ہیں، نوجوان لڑکے لڑکیوں

میں تاخیر سے شادیوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ مرد اور خواتین دونوں میں آبادی کی تخفیف کرنے یا تنہا ہی زندگی بسر کرنے کے خیالات جنم لے رہے ہیں۔ یقیناً یہ مسلم خاندانوں کا افسوس ناک پہلو ہے۔

والدین

مسلمانوں کے عائلی نظام کا دوسرا اہم جز والدین ہیں۔ اسلام نے انہیں جس مقام ومرتبہ اور قدر ومنزلت سے نوازا ہے، کسی دوسرے مذہب اور دین نے نہیں دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہ کثرت ان کے ساتھ نیک برتاؤ اور حسنِ سلوک کرنے کا حکم معاً اپنے بعد دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاعْبُدُواْ اللّهَ وَلاَ تُشْرِكُواْ بِهِ شَيْئاً وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً.[10]

(اور تم سب اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بتاؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔)

اللہ تعالیٰ نے ایمان رکھنے والوں کو اس بات کی بھی تاکید کی ہے کہ اگر والدین بوڑھے اور کم زور ہو جائیں تو بھی ان کی خدمت کی جائے اور ان کے حق میں دعائیں کی جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب والدین اپنے بڑھاپے اور بے چارگی کی عمر کو پہنچیں تو اولاد انہیں بے کار اور بے مصرف سمجھ کر گھر سے نکال دے یا ان کے ساتھ برا سلوک کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَقَضَى رَبُّكَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيراً.[11]

(تمہارے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ "پروردگار! ان پر رحم فرما! جس طرح انہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ بچپن میں پالا تھا۔)

اس کے برعکس مغرب کے عائلی نظام میں والدین کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ چناں چہ وہاں والدین کے پاس نہ تو اولاد کے لیے اور نہ اولاد کے پاس والدین کے لیے وقت، محبت اور جگہ ہے۔ والدین اپنے بچوں کو مارنا تو دور ڈانٹ بھی نہیں سکتے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو اسے پولس گرفتار کر لے گی، یا اسے جیل کی ہوا کھانی

پڑے گی۔مغربی مفکرین اور قانون دانوں کی حتیٰ الامکان کوشش ہے کہ والدین کے اختیار کو کم سے کم کیا جائے اور بچوں کو خودمختار اور آزاد بنایا جائے۔ان ہی اسباب سے بچے اپنے والدین کو ایک بوجھ سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔اولڈ ایج ہوم (Old Age Home) کا تصور بھی مغربی تہذیب کا دیا ہوا ہے، جہاں والدین کو ان کے بچے دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ جاتے ہیں اور سال میں کچھ خاص موقع پر ملاقات کر کے سمجھتے ہیں کہ فرض ادا ہو گیا۔

مسلمانوں کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ انہوں نے مغربی تہذیب کی تقلید میں والدین کو نظرانداز کرنا شروع کردیا ہے۔نوجوان نسل کی اکثریت ان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہے۔ان کی خدمت اوراحترام کا جذبہ مفقود ہو رہا ہے۔ذات پرستی (Individualism) اور خودغرضی (Selfishness) بڑھتی جارہی ہے۔بالخصوص شادی کے بعد والدین کے لیے گھروں میں یا تو جگہ نہیں ہوتی ہے یا ہوتی بھی ہے تو انہیں وہ مقام اور حیثیت نہیں دی جاتی ہے جس کی تاکید اسلام نے کی ہے۔بسا اوقات ان سے مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ اور بدسلوکی کی جاتی ہے، یا ان کی ضروریات کو پورا نہیں کیا جاتا ہے۔انہیں روحانی، نفسیاتی اور جسمانی تکلیفیں دی جاتی ہیں۔نیز مسلم ممالک میں 'اولڈ ایج ہوم' کا تصور عام ہو چکا ہے۔خود ہندوستان میں اب ایسے آشرم یا ادارے قائم ہو رہے ہیں جن میں بوڑھے افراد کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔[۱۲]

زوجین

اسلامی عائلی نظام زندگی کا تیسرا اہم حصہ 'زوجین' ہیں۔اسلام میں نکاح کا مقصد یہ ہے کہ نفس کی تسکین ہو اور نسلِ انسانی کا سلسلہ مزید آگے بڑھتا رہے۔نیز مرد وعورت آپس میں محبت ومودت، شفقت ومہربانی، باہمی تعاون کے ساتھ زندگی بسر کریں، تاکہ ایک محفوظ خاندان پروان چڑھ سکے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً.[۱۳]

(اوراس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔)

نبی کریم ﷺ نے بھی عورتوں سے حسنِ سلوک کی تاکید کی ہے۔ارشادِ نبوی ہے:

ان المرأة خلقت من ضلع، لن تستقيم لک علیٰ طريقة، فان استمتعت بها استمتعت بها و بها عوج، و ان ذهبت تقيمها كسرتها، و كسرها طلاقها.[۱۴]

(عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، تم کسی بھی صورت میں اسے سیدھا نہیں کر سکتے، اگر تم اس کے ٹیڑھا رہتے ہوئے لطف اندوز ہو گے تبھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہو، ورنہ اگر سیدھا کرنے لگو گے تو ٹوٹ جائے گی اور اس کا ٹوٹنا طلاق ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے پیش نظر میاں بیوی کے حقوق اور دائرہ کار متعین کر دیے ہیں اور قرآن و سنت میں دونوں کو تاکید کی ہے کہ وہ اپنے حقوق کا خیال رکھیں، تاکہ عائلی نظام زندگی متاثر نہ ہو، یعنی دونوں کو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ حقوق کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں، ورنہ ان سے باز پرس کی جائے گی، لیکن اس سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے معاون اور رفیق کار رہیں:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ. [15]

(اور مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔)

اس کے برعکس مغربی عائلی نظام میں نکاح کی کوئی خاص اہمیت وضرورت نہیں ہے۔ نیز اس میں مرد اور عورت دونوں کو یکساں 'حقوق' / 'آزادی' دی گئی ہے یعنی ایک طرح سے دونوں کو ایک دوسرے کے حریف کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب عورت نکاح کے بعد اپنی عائلی زندگی کا آغاز کرتی ہے تو اس کا ذہن مرد کو گھر کا سربراہ اور نگراں کے طور پر قبول نہیں کرتا اور پھر ازدواجی زندگی تلخ سے تلخ ترین ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی سوچ کے ساتھ جب وہ مغربی تہذیب کے مختلف پرفریب نعروں کے زیر اثر باہر نکلتی ہے تو بچوں کی تعلیم وتربیت، پرورش اور دیکھ بھال نیز دیگر گھریلو ذمہ داریاں متاثر ہوتی ہیں۔ ان تمام کے مضر اثرات کہیں نہ کہیں عائلی نظام پر بھی پڑتے ہیں۔

مغربی عائلی نظام میں زوجین کے حوالے سے ایک مضر پہلو، جس نے اس پر نمایاں اثر ڈالا ہے، وہ یہ کہ اس میں بیوی کے نان نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر نہیں ڈالی گئی ہے اور نہ اسے اس کا پابند بنایا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے گھر سے باہر قدم نکالتی ہے، جو اس کے اخلاقی، معاشی، ذہنی، دماغی اور جسمانی استحصال کا سبب بنتا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی مسلمانوں کے خاندانی نظام میں مغربی تہذیب اور اس کے افکار ونظریات نے اپنے قدم جما لیے ہیں، جس کی وجہ سے زوجین کے درمیان معمولی باتوں پر لڑائی، جھگڑا، مار پیٹ، تشدد اور طلاق کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے حقوق وفرائض سے غافل ہیں۔ اس میں بہت حد تک مغربی فلموں، کہانیوں، ناولوں، ڈراموں اور اسی قبیل

کے دیگر ذرائع ابلاغ کا اہم کردار رہا ہے، جن میں ازدواجی زندگی کو حقیقی زندگی سے بالکل ہی مختلف اور خوش نما بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ مرد اور عورت جب اپنی حقیقی زندگی میں قدم رکھتے ہیں اور معاملات کو اس سے برعکس پاتے ہیں تو وہ ذہنی دباؤ اور انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں، پھر انہیں خاندانی نظام کو باقی رکھنے میں کوئی کشش نہیں رہتی ہے۔

اسباب و مظاہر

امت مسلمہ کی بدقسمتی رہی کہ اس کے پاس اسلامی تہذیب وثقافت کا پورا ایک نظام ہونے کے باوجود وہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوتی چلی گئی اور اس کا اثر مسلمانوں کے عائلی نظام پر بھی ہوا۔ اس صورت حال پر اگر غور کیا جائے تو اس کے دو اسباب نظر آتے ہیں:

(الف) داخلی عوامل

مسلمانوں کے عائلی نظام زندگی پر مغربی اثرات کا ایک اہم سبب خود ان کا اپنے دین و مذہب اور اسلامی تہذیب سے دور ہونا ہے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم کو، جو ان کی شریعت کا پہلا ماخذ اور سراپا ہدایت ہے، نیز احادیث یا اسوۂ نبوی کو تھامے رکھا، نہ تو کسی دوسری تہذیب وثقافت سے متاثر ہوئے اور نہ ان کی عائلی نظام زندگی میں کوئی تہذیب شگاف ڈال سکی، کیوں کہ یہ دونوں ہی ایسے ماخذ ہیں جن کے ذریعے خیر و شر میں تمیز اور مختلف تہذیبوں کے تاریخی نشیب و فراز کا مطالعہ کرتے ہوئے بہ آسانی عبرت و نصیحت حاصل کی جاسکتی ہے۔

دوسرا اہم سبب، جس نے مسلمانوں کی عائلی نظام زندگی پر مغربی تہذیب کے اثرات نقش کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، وہ ان کا اپنے حقیقی تعلیمی نظام سے دوری اختیار کرتے ہوئے مغربی نظام تعلیم کو اختیار کرنا ہے۔ اولاً تو امت مسلمہ تعلیمی میدان میں پیچھے ہے، مزید ستم یہ کہ اس نے ایک ایسے تعلیمی نظام کی پیروی کی ہے جس میں مرکزیت اللہ رب العزت کی نہیں ہے۔ ایسی تعلیم سے فارغ افراد کی قوتِ فکر و عمل کا منہج کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر خورشید احمد اپنے مقالہ میں سورۃ العلق کی ابتدائی آیات کی تشریح میں لکھتے ہیں:

> ''ان آیات میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ پڑھو، اللہ کے نام سے، یعنی اللہ کی معرفت، اللہ سے رشتہ جوڑنا۔ مالک سے انسان کا رشتہ ان کی پہلی منزل ہے۔ اس رشتے کے بغیر جو علم بھی ہے وہ نامکمل اور ناپختہ ہے، جس کی حیثیت محض خبر (Information) کے گرد گھومنے تک محدود رہتی ہے اور وہ حکمت (Wisdom) تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔''[۱۶]

(ب) خارجی عوامل

جب کوئی قوم کسی دوسری قوم پر غالب آتی ہے تو مغلوب قوم زندگی کے ہر میدان میں اس کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ یہی حال امتِ مسلمہ کے ساتھ ہوا۔ نیز اس میں یورپ کی تحریک آزادیٔ نسواں، صنفی مساوات، حقوق نسواں اور نیو ورلڈ آڈر وغیرہ کے پرفریب نعروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یورپ نے اپنے افکار ونظریات کے فروغ کے لیے نہ صرف اقوام متحدہ، سیڈا اور اسی طرح کی دیگر بین الاقوامی تنظیمیں تشکیل دیں، بلکہ ان کے تحت مختلف کانفرنسیں، سیمینار اور پروگرام وغیرہ منعقد کرانے کی پالیسی بنائی ہے۔ مغربی مفکرین بھی اپنی تحریروں میں اسلامی تہذیب کو اپنی قوم ونسل کے لیے 'خطرہ' ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ امریکہ کے ایک مشہور جریدے میں اس کے مدیر مارٹن بی زگ نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا:

> ''جس طرح روس کے آنجہانی رہنما جوزف اسٹالن نے کمیونزم کے دفاع کے لیے یورپ و امریکہ سے طویل جنگ لڑی، اسی طرح اب مغرب کو اپنے کلچر ونظریات کی بقا کے لیے اسلام سے جنگ لڑنی ہوگی، کیوں کہ مسلم بنیاد پرست اپنے متشددانہ نظریات کو دنیا بھر میں پھیلانے میں مصروف ہیں، جن سے نہ صرف مغرب کے سیاسی ومعاشی فلسفوں اور ان کے نظاموں، ان کے کلچر اور عالمی مفادات کو شدید خطرات لاحق ہیں بلکہ ان کے مذہبی عقائد بھی اسلام کے خطرے کی زد میں ہیں۔ اس کا مداوا سوائے جنگ کے اور کچھ نہیں ہے۔''[۱۷]

رہی سہی کسر مغرب کے دیے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام، سودی معاشی نظام، بے روزگاری، مہنگائی، پرائیوٹ تعلیمی نظام، آئی ایم ایف، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، سستی فیملی پلاننگ، کرپشن اور عالمی مالیاتی اداروں کی سخت شرائط نے پوری کردی ہے۔ یہ سب ایسے جال ہیں جن میں مسلم ممالک بری طرح پھنسے ہوئے ہیں، نیز ان کے ذریعہ فی کس آمدنی اتنی کم کردی گئی ہے کہ مرد کا خاندان کی کفالت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ شادی کے بغیر آزادانہ زندگی گزارنے کو زیادہ پسند کرتا ہے۔

مسلمانوں کے عائلی نظام کو خراب کرنے میں مغرب کے ذرائعِ ابلاغ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت سے یقیناً انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن تجارتی پہلو سے جو کلچر اس سے وجود میں آرہا ہے وہ انتہائی خطرناک ہے۔ اس کے ذریعہ گھروں میں غیر ضروری اشیاء کی خریداری کا رجحان بہت تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے اور ان سے محرومی کی صورت میں احساس کم تری، آپسی بحث ومباحثہ، لڑائی اور طلاق تک نوبت پہنچ رہی ہے۔ یہ اور اسی قبیل کے دیگر مفاہیم بالواسطہ طور پر اسلامی عائلی زندگی کی فکری بنیادوں کو ڈھانے کا سبب بن رہے ہیں۔

مسئلہ کا حل، تجاویز اور مشورہ

درج بالا بحث اور دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی عائلی نظام مغربی تہذیب وثقافت سے متاثر ہو چکا ہے اور اس کے اندر بھی بہت حد تک وہی جراثیم سرایت کر گئے ہیں جو مغربی عائلی نظام میں پائے جاتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ اور تباہی کے اس طوفان کو کس طرح سے روکا جائے؟ کن اقدامات سے اسے حل کیا جاسکتا ہے؟ ہمیں بحیثیت مسلمان کیا کرنا چاہیے؟ اور کس طریقے سے اس چیلنج کا مقابلہ کرنا چاہیے؟ کیا اسلام اس سلسلے میں کوئی رہ نمائی کرتا ہے؟ ذیل میں اس حوالے سے بعض تجاویز پیش کی جارہی ہیں، جن کے ذریعہ ان مسائل پر یقیناً کافی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے:

☆ مسلمانوں میں اس بات کا شعور پیدا کیا جائے کہ 'اسلامی تہذیب' اور 'مغربی تہذیب' دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، نیز دونوں کے افکار ونظریات اور بنیادی وعملی اساسیات باہم متضاد ہیں۔اس لیے عائلی نظام زندگی میں مغربی تہذیب کے اصولوں کو کلّی طور پر رد کر دینا چاہیے، البتہ اپنی تہذیب وثقافت کے اصولوں پر چلتے ہوئے مغرب کے تجربات اور وسائل سے مستفید ہونا کوئی حرام اور ناجائز بات نہیں ہے، لیکن اس میں احتیاط لازم ہے کہ ہم مرعوب ذہن کے ساتھ اس کی مکمل اقتدا اور پیروی نہ کرنے لگیں، ورنہ پھر وہی نتائج سامنے آئیں گے جن سے اس وقت مغرب دوچار ہے۔

☆ مسلم معاشرے میں ہر شخص/ خاندان تک عائلی نظام زندگی کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کو پہنچانا اور اسے یقین دلانا کہ اسی میں خاندان کے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی مضمر ہے۔اس سلسلے میں سمینار، ورک شاپ، ڈبیٹ، پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا، جاذب نظر تعارفی تمثیلوں اور دیگر ذرائع ابلاغ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے، نیز اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور مساجد وغیرہ میں عائلی نظام کے موضوع پر خطبات کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔

☆ مسلم معاشرے میں لڑکے اور لڑکیوں کی مناسب وقت پر شادی کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ ان کی عصمت وعفت محفوظ رہ سکے اور مخلوط تعلیم یا ملازمت کے دوران ان کے بھٹکنے کے مواقع کم سے کم ملیں۔اس سلسلے میں پیش آنے والی رکاٹوں جیسے جہیز وغیرہ کے خلاف مہم چلائی جائے، کیوں کہ اگر انہیں غیر اخلاقی رشتے قائم کرنے کے مواقع زیادہ اور آسانی سے ملیں گے تو پھر ان کے درمیان خاندانی رشتے کا وجود صرف خام خیالی ہوگی۔

☆ مسلم معاشرے میں موجود شادی بیاہ اور اسی طرح کے دیگر معاملات میں غیر ضروری مقامی اور علاقائی رسم ورواج / روایات کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور عورتوں کو اسلام کے عطا کردہ حقوق دیے جائیں۔بعض تنگ نظر مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات جم گئی ہے کہ ان کے دین میں عورتوں کے کوئی خاص

حقوق نہیں ہیں، بلکہ بعض فرائض ہیں اور خواتین ان کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔

☆مسلم خواتین کو مغربی تہذیب کے زیر اثر عائلی نظام کی خرابیوں سے واقف کرایا جائے، نیز ان کے سامنے اس سلسلے میں اقوام متحدہ اور اسی طرح کے دیگر عالمی اداروں کے ذریعے عورتوں کو 'مساوات' اور 'آزادی' کے نام دیے گئے 'حقوق' کی حقیقت کو واضح کیا جائے۔ مزید برآں ان کی سرگرمیوں، مقاصد، اہداف اور مضر اثرات کو مختلف رپورٹس اور اعداد وشمار کے ذریعے عام کیا جائے۔

☆عورت کے اصل کردار یعنی مادریت (Motherhood) کی اہمیت وافادیت کو معاشرے میں میڈیا اور مضامین کے ذریعے اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے۔قرآن وحدیث نے ماں کے مقام اور درجے کے تعلق سے نہایت اہم باتیں پیش کی ہیں، ان کو دل چسپ انداز میں مسلم خواتین کے سامنے پیش کیا جائے۔

☆ خاندان کے بنیادی عناصر والدین، زوجین اور اولاد کے درمیان تعلق اور رشتہ کم زور کرنے والی خرابیوں اور برائیوں پر غور کرتے ہوئے ان سے اجتناب کیا جائے، تاکہ خاندانی نظام مضبوط ہو سکے۔ خاندان کی اہمیت، ضرورت اور نزاکت سے لوگوں کو واقف کرانے کے لیے ملک کی مختلف تنظیموں اور اداروں کی جانب سے آگاہی مہم چلائی جائے۔

☆ دینی جماعتوں اور تنظیموں کی جانب سے 'خاندان فنڈ' کا آغاز کیا جائے اور اس کا مقصد غریب خاندان کی بہ قدر ضرورت کفالت، گھر بسانے کی خواہش رکھنے والے مرد اور عورت کی قرض حسنہ کے طور پر امداد، بیوہ اور مطلقہ کی دوبارہ شادی کرانا وغیرہ ہوسکتا ہے۔

☆مسلم نوجوانوں میں مغربی تہذیب کے خطرات، جیسے خاندانی منصوبہ بندی، جنسی بے راہ روی، آزادانہ اختلاط اور نفسیاتی وجسمانی بیماریوں سے واقف کرایا جائے، تاکہ وہ ان سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔

☆اسلامی میڈیا کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس کے ذریعہ مغربی تہذیب وثقافت اور اس کے عائلی نظام کے نقصانات کو مسلم معاشرے میں تنقیدی نظر سے پیش کیا جائے۔ مزید برآں اسلامی عائلی نظام کی اہمیت، فوائد اور اس کے اخلاقی اقدار کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا جائے کہ انسانیت کی بھلائی اور کامیابی اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ مغربی میڈیا اور اس کے اثرات کو نئی نسل عمداً اور غیر عمداً بہت تیزی سے قبول کر رہی ہے، جس سے ان کے اندر اخلاقی زوال وانارکی پیدا ہو رہی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

ا۔ محمد قدری پاشا (1821-1886) مصر کے شہر ملوی (Mallawi) میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار مصر کے بڑے علماء اور

فقہاء میں ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی تعلیم قاہرہ اور مدرسہ الالسن سے حاصل کی۔ملک کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔قاہرہ میں ہی ان کا انتقال ہوا۔موصوف کی مشہور کتابوں میں الاحکام الشرعیة فی الاحوال الشخصیة، تطبیق ما وجد فی القانون المدنی موافقا لمذھب ابی حنیفه،قانون العدل و الانصاف فی القضاء علی مشکلات الاوقاف اور مفردات فی علم النباتات ہیں۔

۲۔ ملاحظہ ہو:محمد قدری باشا،الاحکام الشرعیة فی الاحوال الشخصیةعلیٰ مذھب ابی حنیفة النعمان،دار ابن حزم،للطباعةوالنشروالتوزیع،بیروت–لبنان

۳۔ اس حوالے سے سموئل فلپس ہنٹنگٹن (Samuel P. Huntington 1927-2008) نے اپنی کتاب The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order میں تفصیلی بحث کی ہے ،ملاحظہ ہو: Samuel P. Huntington, Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, Simon & Schuster, Rockefeller Center, 1230 Avenue of the Americas, New York.

۴۔ پروفیسر ثریا بتول علوی،جدید تحریک نسواں اوراسلام،منشورات،منصورہ،ملتان روڈ،لاہور،اشاعت دوم،۲۰۰۰،ص ۲۷

(5)Richard G Wilkins, Professor of Law and Director of the World Family Policy Center, Brigham Young University, Utha, America

۶۔ صحیح بخاری:۱۳۸۷ ۷۔ابوداؤد:۲۱۷۷،البتہ محدثین نے اس حدیث کوضعیف قرار دیا ہے۔

(8)Edmund Leach, A Runaway World?, Reith Lectures 1967, The British Broadcasting Corporation, 35, Marylebone High Street, London, 1968

(9)Linda Nicholson, The Myth of the Traditional Family, Feminism and Families, Edited and with an Introduction by Hilde Lindemann Nelson, Routledge, 29, West 35th. Street, New York, P.27

۱۰۔ النساء:۳۶ ۱۱۔بنی اسرائیل:۲۳-۲۴

۱۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: http://www.seniorindian.com/old_age_homes_list.htm

۱۳۔ الروم:۲۱ ۱۴۔مسلم:۱۴۶۸ ۱۵۔التوبة:۷۱

۱۶۔ پروفیسر خورشید احمد،''تہذیب،خاندان اور معاشرہ''،عورت خاندان اور ہمارا معاشرہ:مسائل اور لائحہ عمل،انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز،اسلام آباد،۲۰۰۷ء،ص ۱۳

۱۷۔ بحوالہ مولانا محمد عیسیٰ منصوری،مغرب اور عالم اسلام کی فکری وتہذیبی کشمکش اور مسلم اہل دانش کی ذمہ داری،ورلڈ اسلامک فورم،لندن،طبع اول،۲۰۰۰ء،ص ۸۹

دعوتِ دین: فریضہ اور تحفظ ملت کا سامان

محمد انس فلاحی مدنی

اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کی حیثیت اپنے خلیفہ کی متعین کی ہے۔ انسان کی تربیت و رہنمائی اور بندگی رب کا طریقہ اور شاہ راہ دکھانے کے لیے اللہ نے انھیں میں سے ہر زمانے میں انبیاء اور رسول مبعوث کیے۔ ان پر احکام و ہدایات نازل فرما کر بندوں کے لیے راستی اور زندگی کی درستگی کا سامان مہیا کیا۔ انبیاء و رسل انسانوں میں سے ہی مبعوث کرنے کے پیچھے حکمت یہ تھی کہ وہ یہ شکوہ و شکایت نہ کر سکیں کہ یہ تو مافوق البشر ہیں، ان کے لیے تو احکام خداوندی کی بجا آوری ممکن اور آسان ہے اور انسانوں کے لیے مشکل اور ناممکن ہے۔ انبیاء و رسل ہر علاقے اور ہر قوم میں مبعوث کیے گئے۔ ایک وقت میں ایک سے زائد انبیاء و رسل بھی موجود رہے۔ یہ انتظام صرف اس لیے تھا کہ انسان اپنے خالق کو پہنچانے، اپنے مالک اور رازق کی بندگی اور غلامی کے بعد ہر طرح کی غلامی سے محفوظ رہے۔ وہ اس کے آگے ہی جھکے، اس سے ہی مانگے اور اسی سے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے دعا و مناجات کرے۔

ہر نبی اور رسول نے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو بندوں تک پہنچایا۔ اس کے نتیجے میں انھیں شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، قوم اور سردارانِ قوم کے طعنے اور ظلم و ستم سہنے پڑے اور قوم کے مخالفین اور مجرمین نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ انھیں قتل کرنے سے بھی باز نہیں آئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے قاصد، رسول اور نبی کی مخالفت، ان پر ظلم و ستم اور قتل ہونے کے باوجود انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے انبیاء مبعوث کرتا رہا۔ اللہ نے تمام دنیا کے لیے ایک ہی رسول نہیں بھیجا، بلکہ ہر قوم اور ہر علاقے اور زمانے کے لیے الگ الگ رسولوں کا انتخاب کیا۔ نبوت و رسالت کا سلسلہ حضرت محمد ﷺ تک چلتا رہا۔ آپؐ کو اللہ نے آخری رسول اور خاتم النبیین بنا کر بھیجا۔

رسولؐ کی رسالت تمام جہانوں، تمام انسانوں اور رہتی دنیا تک کے لیے ہے۔ نبی ﷺ سے پہلے ہر نبی اور رسول اپنی قوم، علاقے اور زمانے کے لیے تھے۔ لیکن آپ کی بعثت آخری رسول اور نبی کی حیثیت سے ہوئی ہے۔

جب تک انسانی زندگی کا اجتماعی شعور اور تمدن پروان نہیں چڑھا تھا، تب تک اللہ تعالیٰ نے ہر قوم، علاقے اور زمانے کے لیے الگ الگ رسول بھیجے۔ خاتم الانبیاء کی بعثت کے حوالے سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ رقم طراز ہیں:

''جب تک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وہ وسائل نہیں پیدا کر لیے جو ساری دنیا کو ایک داعیِ حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لیے ضروری تھے، اس وقت تک اللہ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کو بھیجنا جاری رکھا۔ لیکن جب انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی اور اجتماعی شعور اتنا بیدار ہو گیا کہ وہ ایک عالم گیر نظامِ عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائلِ اجتماع و تمدن نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغام ہدایت دنیا کے ہر گوشے میں بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجے اور ان کے ذریعے سے لوگوں کو وہ مکمل نظامِ زندگی عنایت فرمائے۔ جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے بالکل مطابق ہو۔''[1]

انبیاء کی دعوت

انبیاء کی دعوت اور پیغام یہی رہا ہے کہ انسان اس دنیا کی زندگی میں مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے نجات کا سامان تیار کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ اسے رب کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔ انسان اپنے خالق کو پہچانے اور اپنے انجام سے واقف ہو۔ خدا کی بندگی کا صلہ اور نافرمانی پر عذاب کی وعید بھی اس کے سامنے رہے۔ مولانا سید جلال الدین عمری انبیاء کی دعوت اور پیغام کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''دنیا اور آخرت ہر جگہ انسان کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے اور اسی سے اس کی دنیوی زندگی کے تمام الجھے ہوئے مسائل بھی حل ہوں گے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو ماننا ہی انسانی زندگی کی صحیح ترین اساس ہے اور اس کے نہ ماننے ہی سے تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔''[2]

دعوت، مفہوم اور تقاضے

دعوت کا مفہوم قرآنی آیات کی روشنی میں یہی ہے کہ بندگانِ خدا کو خدا کی طرف بلانا۔ اس کی بندگی و طاعت کا درس دینا۔ انبیاء کی دعوت کے ضمن میں بھی اس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ دعوت کا بہت سادہ سا مفہوم یہی ہے۔ انبیاء اور رسولوں کی دعوت یہی تھی اور یہی دعوت آخری رسول حضرت محمدؐ کی تھی اور آخری نبیؐ کی

آخری امت ہونے کی حیثیت سے اب یہ ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے کہ وہ رسول ﷺ کے مشن کو آگے بڑھائیں ۔ دعوت دین کا یہ کام ان کے لیے اختیاری نہیں ہے، بلکہ دیگر احکام وعبادت کی طرح اس کی ادائیگی لازم ہے۔اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی پر بازپرس اوراس کی ادائیگی میں اجر وثواب کا ملنا یقینی ہے۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے اورایک عام انسان ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارا یہ انسانی اور دینی فریضہ ہے کہ ہم لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دیں ۔ جس خیر کے ہم متبع اور راہی ہیں، جو ہماری دنیا وآخرت میں کامیابی وکامرانی کا ذریعہ اور مقصد ہے ۔ اسے دوسروں کے لیے بھی عام کریں ۔ اس سے دوسروں کو بھی آگاہ کریں۔ آخرت، جنت وجہنم اور عذاب وانعام کے جس عقیدے پر ہم ایمان ویقین رکھتے ہیں۔ اس کی طرف لوگوں کو بلائیں تاکہ وہ جنت کے مستحق بنیں اور جہنم کی وادیوں میں جانے والی بچ جائیں۔

امت مسلمہ پر یہ فریضہ حکم خداوندی سے بھی عائد ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران:۱۰۴)

’’تم میں سے کچھ لوگ ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں ۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔‘‘

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْراً لَّهُم مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُون (آل عمران:۱۱۰)

’’اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو، جسے انسانوں کی ہدایت وصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے تو انھی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔‘‘

حدیث نبوی ﷺ میں دین کی تبلیغ اور نشر واشاعت کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: بلغوا عنی ولو آیة ’’میری طرف سے پہنچادو، چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔‘‘[۳]

اس سلامتی کے راستے کی طرف دعوت دینا ہر خیر اور ہر بھلائی کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (فصلت:۳۳)

(اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔)

دعوتِ دین کا کام دینی سرگرمیوں میں شعبہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ تمام دینی سرگرمیوں کا مرکز ومحور ہونا چاہیے۔ سارے کام اسی کے تحت اور اسی نہج کے مطابق ہونے چاہیے۔

ملک عزیز ہندوستان میں اسلام کی دعوت کا آغاز اور اسلام کے اولین نقوش عرب تاجروں کے ذریعے جنوبی ہند میں ملتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے تجارتی منافع کے حصول کے ساتھ اہل ہند کو دنیوی، اخروی اور ابدی نفع کی دعوت، یعنی اسلام کا تعارف اور پیغام پہنچایا۔ عرب تاجروں کے اخلاقی اور معاشرتی طرزِ عمل نے اہل ہند کو جلد ہی گرویدہ بنالیا اور لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔

عرب تاجران، مسلم حکمراں اور صوفیاء کی کوششوں کے باوجود ہندوستان میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، ہزار سال کے قریب مسلم حکومت ہونے کے باوجود بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہونے سے کیوں رہ گئی؟ یہ سوال ہر شخص کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

موجودہ ہندوستان میں اعداد وشمار سے قطع نظر ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی غیر مسلم معاشرے میں رہتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ غیر مسلم تا حال اسلام سے قابل افسوس حد تک ناواقف ہیں۔ وہ مسلمانوں کی روزمرہ کی عبادات نماز، روزہ اور اذان، مسجد کے مفہوم ومقصد سے بھی نا آشنا ہیں۔ اس پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔ کیا ماضی میں مسلم علماء اور حکمراں نے دعوت کے فریضے کی انجام دہی کے لیے اجتماعی شعور کو بیدار کیا، نیز ان کے دور میں اس حوالے سے اجتماعی کوششیں ہوئی ہیں؟

اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ علماء کی اکثریت دعوت واصلاح کے مفہوم ومقاصد سے ناواقف رہی ہے۔ دعوت واصلاح کے رائج غلط تصور نے طویل عرصے تک امت کی بڑی تعداد کو دعوت دین کے فریضے سے روکے رکھا۔ اصلاح امت کی کوششوں نے مسلم امت کے مصلح طبقہ کو امت کے اندر دعوت دین کی بیداری پر آمادہ ہی نہیں کیا۔

ہمارے دینی مکاتب ومدارس اور اسکول میں ایسا کوئی نصاب، نظام اور تعلیم وتربیت کا سسٹم نہیں رہا، جو طلبہ کے اندر داعیانہ مزاج وتڑپ کی آبیاری کرے اور ان کی ذہن سازی کرے۔ بڑے بڑے دینی مدارس کے تفصیلی نصاب ونظام کا جائزہ لے لیجیے، وہاں غیر مسلموں کے لیے دعوت دین کے عنوان سے سرسری نصاب بھی موجود نہیں ہے۔ پروفیسر محسن عثمانی حفظہ اللہ نے مدارس اسلامیہ کی اس کوتاہی پر شدید تنقید کی ہے رقم طراز ہیں:

''اس ملک میں مسلمانوں کے روشن مستقبل کا انحصار بہت وسیع پیمانہ پر دعوت اور اسلام کے

تعارف کے کام پر ہے، ملک کی آزادی کے وقت سے ہی ان نئی ذمہ داریوں کے لیے تیار ہونا چاہیے تھا۔ اوران ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نصاب کی تشکیل ہونی چاہیے تھی۔ افتاء کے شعبوں کی طرح دعوت کے شعبے قائم ہونے چاہیے تھے۔ مدرسہ کا کام درحقیقت یہ ہے کہ وہ عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق اور ملک کی فضا اور ماحول کو سامنے رکھ کر اسلام کی خدمت انجام دے''۔[۴]

مدارس اسلامیہ کی تعلیم وتربیت میں اس بات کا تو خاص اہتمام ہے کہ ایسے علماء اور فضلاء تیار ہوں جو امت کے اندر اصلاح وتربیت کا کام کرسکیں، عصری مسائل میں دینی رہنمائی کرسکیں۔ حلت وحرمت کے فتاوی بیان کرسکیں۔ لیکن غیر مسلموں میں دعوت دین کے لیے جس ساز وسامان اور جس تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے اس میں انھیں کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اہل مدارس اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے ہیں۔ مدارس کا نصاب ونظام جس زبان میں ہے اس سے غیر مسلموں میں دعوت کا کام کرنا تو دور، آئندہ حالات میں اس زبان کے ساتھ امت میں اصلاح کی کوششیں بھی بار آور نہیں ہوسکتی ہیں۔

دعوت اور لسان قوم

انبیاء کی تاریخ اور قرآن کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تمام ہی انبیاء اپنی قوم میں سے ہی مبعوث کیے گئے اور وہ قوم کی زبان میں ہی گفتگو کرتے تھے۔ خدا کا پیغام وہ قوم کی زبان میں ہی پہنچاتے تھے نیز وہ زمانے کے حالات اور تقاضے سے بھی کما حقہ آشنا تھے یہی وجہ رہی کہ کبھی قوم نے یہ شکایت نہیں کی کہ ہم تمھاری بات سمجھنے سے قاصر اور عاجز ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (ابراھیم:۴)

''ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔ پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے، وہ بالادست اور حکیم ہے۔''

لسان قوم سے کیا مراد ہے اس پر جناب خان یاسر لکھتے ہیں:

''لسان قوم سے مراد صرف یہی نہیں کہ 'قوم اور نبی' کی زبان ایک ہوا کرتی ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ نبی اپنی قوم کے مسائل، ترجیحات، عادات واطوار سے بیگانہ نہیں ہوتا۔ وہ وقت کے

مسائل سے تعرض کرتا ہے اور ان کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔ اس کے بغیر اس کی دعوت مکمل ہو ہی نہیں سکتی کہ اسلام مجرد عقائد کا دین نہیں بلکہ ایک ایسا نظام ہے جسے فرد اور سماج کی پوری زندگی پر نافذ ہونا ہے۔''[۵]

المیہ یہ ہے کہ لسان قوم کے اس مفہوم کے تناظر میں دعوتی فریضہ انجام دینے والے گنے چنے افراد ہیں ایسے داعیان دین کی شدید قلت ہے جو زمانے کے حالات، تقاضے اور قوم کے مزاج شناس اور ان کے فکری رجحان واٹھان کے مطابق اسلام کی دعوت کا کام انجام دے سکیں۔

ہمارے یہاں دعوت دین کی تیاری اور استعداد کو ضروری ہی نہیں سمجھا گیا۔ اس پر نقد کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں چاہے کسی اور کام کے لیے مسلمان کسی قابلیت کی ضرورت سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں مگر دو کاموں کے لیے وہ سرے سے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھتے، ایک امامت مسجد، دوسرا تبلیغ دین۔''[۶]

منصوبہ بند اور زمانے کے تقاضے کے مطابق دعوتی کوششیں کسی حد تک ہمارے یہاں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر ہو رہی ہیں۔ اس کے مثبت نتائج واثرات حوصلہ بخش ہیں۔ لیکن بڑی کامیابی نہ ملنے کی وجہ جہاں ایک طرف اللہ کی حکمت اور ہماری غفلت وکوتاہی ہے تو دوسری طرف ہماری غیر منظّم دعوتی کوششیں اور عصری تقاضے سے ناواقفیت ہے۔

دعوت کی کامیابی کی تین بنیادی شرطیں ہیں:

ا۔ دعوتی کوششیں باقاعدہ اور منصوبہ بند ہوں: انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر کام کا آغاز باقاعدہ اور منصوبہ بند ہونا چاہیے، ہر کام کی خوبی اور کامیابی اسی میں ہے کہ کام منظّم، باقاعدہ اور منصوبہ بند ہو۔ دعوت دین کے اہم فریضے کو بغیر منصوبہ بندی، الل ٹپ اور بے ڈھنگے طریقے سے کیسے انجام دیا جا سکتا ہے اور وہ کیسے ثمر آور ہو سکتا ہے! اس لیے اس پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔

۲۔ دعوت کا کام زمانے کے تقاضے کے مطابق ہو: زمانے کے حالات، مسائل اور تقاضے کیا ہیں۔ انسانی ضروریات اور مسائل کیا ہیں۔ ان سے واقف ہونا ہر داعی دین کے لیے نہایت ضروری ہے۔ عصری تقاضوں اور مسائل سے ناواقفیت دعوت کے کام میں سدراہ بن سکتی ہے۔

۳۔ عصری اسلوب: تیسری اہم شرط یہ ہے کہ دعوت کا کام عصری اسلوب میں ہو۔ عصری اسلوب میں

متعدد چیزیں شامل ہیں۔ عصری اسلوب میں یہ بھی ہے کہ زبان وبیان مروجہ طریقے کے مطابق وموافق ہو۔ انداز، شستہ اور کھرا ہو۔ الزامی انداز نہ ہو۔

دعوت دین کے موثر وسائل

دعوت دین کے لیے ناسازگار حالات ہمیشہ رہے ہیں، کبھی کم کبھی زیادہ۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حالات جس وقت زیادہ پرخطر اور پریشان کن رہے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے لیے وہی حالات نتیجہ خیز ثابت ہوئے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ تاریکی جتنی بڑھتی ہے روشنی، اجالے اور صبح کی کرن کے آثار اتنے ہی قریب ہوجاتے ہیں۔ ناسازگار حالات کے باوجود موجودہ دور دعوت کے لیے نہایت سنہری موقع ہے۔ جدید وسائل اور ذرائع نے ابلاغ دعوت کے لیے راستے کھول دیے ہیں۔

میڈیا کے ذریعہ محبت ونفرت، خیر وشر اور ہر طرح کے کام کی توسیع وتبلیغ کی جاسکتی ہے اور کی جارہی ہے۔ میڈیا کی دو قسمیں الیکٹرونک میڈیا، پرنٹ میڈیا دونوں کے ہی ناظرین اور قارئین دنیا بھر میں ہیں۔ سوشل میڈیا الیکٹرونک میڈیا کا سب سے بڑا پلیٹ فارم بن چکا ہے، سوشل میڈیا میں فیسبک، یوٹیوب، ٹوئٹر، انسٹاگرام وغیرہ یہ وہ وسائل ہیں جن کے ذریعہ مغرب اور دشمن طاقتیں اباحیت اور اخلاق باختگی کو فروغ دے رہی ہیں۔ آزادی اظہار کے نام پر بے ضمیری اور انسانیت سوز افکار ونظریات کے زہر سے انسانی معاشرے کو تباہ وبرباد کیا جارہا ہے۔

ان وسائل کا استعمال جہاں ایک طرف شر کے لیے ہورہا ہے وہیں ایک تعداد ایسی بھی ہے جو اس کا استعمال خیر وبھلائی کے فروغ کے لیے کررہی ہے۔ غرض کہ ہر چیز کے لیے اس کا استعمال کیا جارہا ہے۔ سوشل میڈیا کا استعمال اب ہمارے مسلم علماء اور داعیان دین بھی کررہے ہیں۔ جس کے حیرت انگیز نتائج سامنے آرہے ہیں۔ ایسے علماء واسکالرس کی خاصی تعداد ہے جو سوشل میڈیا پر اسلام کی تبلیغ اور غلط افکار ونظریات کی تردید کرہے ہیں۔ ان کی یہ ویڈیوز اور تحریریں برق رفتاری سے دنیا بھر میں دیکھنے والوں تک پہنچ جاتی ہے۔

ایسے علماء واسکالرس کا ذکر بے سود نہ ہوگا۔ سب سے پہلے جس نے الیکٹرونک میڈیا کا استعمال شروع کیا۔ جنھوں نے اپنے خطبات ودروس قرآن ریکارڈ کرائے اور ٹی وی اور سوشل میڈیا پر نشر کیے۔ انھیں دنیا، ڈاکٹر اسرار احمد کے نام سے جانتی ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کے دروس کی ریکارڈنگ سوشل میڈیا پر کثرت سے شیئر کی جاتی ہیں۔ ایسے ہی ڈاکٹر ذاکر نائک، جاوید احمد غامدی، انجینئر محمد علی مرزا، مولانا طارق جمیل، مفتی طارق مسعود،

ایڈوکیٹ سید فیض، نعمان علی خان (امریکہ)، مفتی اسماعیل مینک، شیخ عبدالرحمٰن العریفی، راتب النابلسی یہ وہ چند نام ہیں جو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دنیا بھر میں اپنی تقاریر کے ذریعے اسلام کے پیغام کو پہنچا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں سننے والے لاکھوں کی تعداد میں دنیا بھر موجود ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں پہلے ہر چیز کے تعلق سے حلت وحرمت کے فتوی کی بحث شروع ہو جاتی ہے۔ پھر طویل مدت کے بعد اس کے مفید اور مضر پہلوؤں پر علماء کے درمیان گفت وشنید شروع ہوتی ہے۔ پھر علماء ومفکرین کی اس کے بارے میں دورائیں قائم ہوتی ہیں۔ ایک جواز کے قائلین کی دوسرے عدم جواز کے قائلین کی۔ اس نئی چیز کے مثبت استعمال کا جب تک وقت آتا ہے، جب تک علماء اس کے لیے تیار ہوتے ہیں تب تک اس نئی چیز یا ٹیکنولوجی سے ہمہ جہت مضر اثرات پھیل چکے ہوتے ہیں۔ اب رفتہ رفتہ سوشل میڈیا کے استعمال کا رجحان دینی جماعتوں اور دینی لوگوں میں بڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا استعمال جس تیز رفتاری سے ہونا چاہیے اس کی تا حال کمی ہے۔

یہ میڈیا کا دور ہے اس میں اب ہر چیز کی تلاش اور تحقیق کے لیے نیٹ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس ابھی سوشل میڈیا پر ایسے لیکچرس اور دروس کی شدت سے کمی ہے۔ جن میں سلسلہ وار اسلام، اسلامی نظام، تعلیمات، اسلام پر اعتراضات کے جواب اور دعوت دین کے بیانات عصری زبانوں میں موجود ہوں۔

اس حقیقت کا کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ دعوت کے لیے انفرادی ملاقاتیں اور کوششیں ہی دلوں کو بدل دینے کا موثر ذریعہ ہوتی ہیں۔ بہر حال ہمیں آج کے جدید وسائل وذرائع لازمی استعمال کرنا چاہیے۔

دعوت کا مرکز: دل یا دماغ

گفتگو میں دعوت کا مرکز دل ہو یا دماغ۔ داعی مدعو کے دل کو اپیل کرے یا دماغ کو اس پر بھی گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے۔ دل اور دماغ انسانی جسم کے دو ایسے عضو ہیں۔ جن کی سلامتی کے بغیر نارمل زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ یہ انسان کے اندر سوجھ بوجھ، شعور اور احساسات وجذبات کے اثر انداز ہونے کا ذریعہ ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف تک دماغ ہی انسانی عقل کا منبع اور سرچشمہ تصور کیا جاتا تھا۔ کہ دماغ ہی انسان کو قوت فیصلہ فراہم کرتا ہے۔ اسی کے ذریعہ وہ صحیح اور غلط کی تمیز کرتا ہے۔ یہی اس کے ارادوں کے لیے فیصلہ کن کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے آخری نصف میں سائنسدان یہ بات تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان کے دل اور دماغ دونوں ہی صحیح اور غلط کا فرق، ادراک واستدراک کی صلاحیت رکھتے ہیں (اس موضوع پر تفصیلی

مطالعہ کے لیے ڈاکٹر گوہر مشتاق کی کتاب ''انسانی دل اور قبول اسلام ایک مذہبی ،سائنسی تجزیہ' ملاحظہ فرمائیں۔مطبوعہ اذان سحر پبلی کیشنز، لاہور)۔ یہ بات قرآن نے چودہ سو سال قبل ہی کہہ دی ہے۔قرآن کریم میں ۱۳۰ مقام پر'' قلب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔قرآن نے انسانی دل کو فہم وادراک اور احساسات وجذبات کا مرکز قرار دیا ہے۔قرآن میں کافروں کے بارے میں متعدد جگہ فرمایا گیا ہے کہ ان کے دل تو ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لاَّ يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لاَّ يَسْمَعُونَ بِهَا أُوْلَـئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (الاعراف:۱۷۹)

(اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ان کے پاس دل ودماغ ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ان کے پاس کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں۔وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج:۴۶)

(کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے اور ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔)

ایک جگہ دل کے لیے'فؤاد' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَلاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولـئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولاً (سورہ الاسراء:۳۶)

(کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو۔جس کا تمھیں علم نہ ہو۔یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔)

انسانی دل کے بارے میں مسلم علماء نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی ہے،تطویل بحث سے بچنے

کے لیے صرف علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ کی کتاب ''منهاج القاصدين'' کے اقتباس پر ہی اکتفاء کرتے ہیں:

''معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی جسم میں سب سے اعلیٰ وافضل عضو دل ہے۔ یہی اللہ کو جانتا ہے، اس کے لیے عمل کرتا ہے اور اس کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اللہ کے قریب کرنے والا اور صاحب مکاشفہ بھی یہی ہے اور اعضاء اس کے تابعدار اور خادم ہیں۔ وہ ان سے اس طرح کام لیتا ہے جیسے بادشاہ غلاموں سے۔ یہ حقیقت ہے کہ جس نے اپنے دل کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔''[۷]

اس لیے داعی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی گفتگو کا مرکز مدعو کا دل ہو۔ انسان دوران گفتگو ذہنی طور پر تو مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن خاطر خواہ اطمینان قلب نہ ہونے کی وجہ سے وہ بات کو تسلیم نہیں کرتا یا اس پر عمل کے لیے آمادہ نہیں ہو پاتا ہے۔ ہمارے یہاں داعیان دین مدعو کے ذہن کو تو اپیل کرتے ہیں اور اسے قائل بھی کر لیتے ہیں۔ اسلام کے تصور توحید کے عقلی دلائل، رسالت و آخرت کی ناقابل تردید دلیلیں مدعو کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس سے مدعو ذہنی طور پر تو مطمئن ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ گفتگو بیشتر اوقات میں اس کے دل تک نہیں پہنچ پاتی ہے اور جب انسان کا دل مطمئن نہ ہو تو وہ کسی کام کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا ہے۔ رہا قبول اسلام کا معاملہ جس کے لیے اسے اپنے آبائی مذہب سے بغاوت، خاندانی رسم و رواج کی مخالفت اور اہل خانہ کے اعصاب شکن مصائب برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ بھلا وہ اس کے لیے دلی طور پر مطمئن ہوئے بغیر اسلام کیسے قبول کر سکتا ہے!! اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ کی رائے کا ذکر بے سود نہ ہوگا۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں: قبول اسلام میں اصل چیز دل ہے، جب دل ایک تبدیلی پر رضا مند ہو جاتا ہے، اور کسی بات پر قرار پکڑ لیتا ہے تو پھر باقی تمام جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ اس تبدیلی کی تائید کے لیے وقف ہو جائے۔ ہمیں اسلام کے قدیم اور جدید مبلغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے قدیم مبلغوں کا وار غیر مسلموں کے دلوں پر ہوتا تھا، وہ اپنی للّٰہیت، بے نفسی، خوش خلقی، اور احسان و مروت کے جادو اثر اداؤں سے دلوں کو گرویدہ کرتے تھے اور اس طرح ہزار لوگ از خود بغیر کسی بحث و تکرار کے ان کے رنگ میں رنگ جاتے تھے مگر جدید مبلغوں کا سارا زور، دماغ کی تبدیلی پر صرف ہوتا ہے، وہ صداقت اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں، مقابلے میں دوسری حجت غیر مسلم کو پیش کر دیتے ہیں، اس پر بحث و تکرار شروع ہو جاتی ہے، مسلمان اپنی بات پر اڑ جاتا ہے، غیر مسلم اپنے قول پر تن جاتا ہے، اس سے ضد پیدا ہوتی ہے اور ہدایت ختم ہو جاتی ہے۔[۸]

دعوتی لٹریچر کا جائزہ

دعوتی میدان میں تبادلۂ خیال اور ملاقات کے ساتھ لٹریچر کی بہت اہمیت ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ ہمارے یہاں دعوتی لٹریچر کی تیاری میں کسی قدر تیزی آ گئی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دعوتی لٹریچر مدعو کی زبان میں تا حال ناقص ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں ایسے چند ہی ادارے اور مکتبات ہیں، جہاں سے ہندوستانی زبان میں دعوتی لٹریچر شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں چند ادارے قابل ذکر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۱۔ پیامِ انسانیت	مولانا سید بلال حسنی ندوی
۲۔ شعبہ دعوت جماعت اسلامی ہند	جناب محمد اقبال ملا
۳۔ مدھر سندیش سنگم	مولانا نسیم غازی فلاحی

دعوتی لٹریچر میں چند موثر کتابیں جن کے ترجمے ہندی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جو دعوتی میدان میں بہت معاون و موثر ہیں۔

۱۔ سلامتی کا راستہ (ہندی)	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۲۔ بناؤ بگاڑ ہندی (ہندی)	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۳۔ وحدت بنی آدم (ہندی)	مولانا سید جلال الدین عمری
۴۔ زندگی بعد الموت (ہندی)	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۵۔ خطبات (ہندی)	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۶۔ رسالۂ دینیات (ہندی)	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
۷۔ حق کی تلاش (ہندی)	جناب محمد اقبال ملا

ان سب کتابوں کے ساتھ مولانا محمد کلیم صدیقی حفظہ اللہ کی مختصر کتاب ’آپ کی امانت آپ کی سیوا میں‘ نہایت مفید اور مؤثر ہے۔ بڑی تعداد غیر مسلموں کی اس کتاب سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتی ہے۔ دعوتی میدان میں کام کرنے والے افراد کے لیے مولانا عبد الحمید نعمانی اور مفتی محمد سرور فاروقی ندوی کی کتابیں بھی اپنے مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔

۱۔ ہندوستان کی تہذیبیں (اعلی و ادنی ذات کے کاموں کی تقسیم اور منواسمرتی)، مفتی محمد سرور فاروقی

۲۔ الحاد یعنی لامذہبیت (تاؤازم، کنفیوشس، مانویت مذاہب کا مختصر تعارف) مفتی محمد سرور فاروقی
۳۔ پنرجنم اور آواگون کا تصور (عقلی دلائل کی روشنی میں) مفتی محمد سرور فاروقی
۴۔ زبردستی اسلام قبول کروانے کی معمار انسانیت اور اسلامی جہاد مفتی محمد سرور فاروقی
۵۔ عیسائی مذہب اور ان کے فرقوں کا تعارف مفتی محمد سرور فاروقی
۶۔ ہندو دھرم، فرقے تنظیمیں اور اداروں کا تعارف مفتی محمد سرور فاروقی
۷۔ ہندو دھرم گرنتھوں میں توحید و رسالت اور آخرت جیسا تصور مفتی محمد سرور فاروقی
۸۔ جناب گرونانک جی اور سکھ دھرم کا تعارف مفتی محمد سرور فاروقی
۹۔ بہائی مذہب اور ان کے فرقوں کا تعارف مفتی محمد سرور فاروقی
۱۰۔ یہودی مذاہب اور ان کے فرقوں کا تعارف مفتی محمد سرور فاروقی
۱۱۔ ہندو مذہب کے اہم تیوہار مفتی محمد سرور فاروقی
۱۲۔ بدھ مت کا مختصر تعارف مفتی محمد سرور فاروقی
۱۴۔ بدھ مت اور اسلام مفتی محمد سرور فاروقی
۱۵۔ پران کا تعارف مفتی محمد سرور فاروقی
۱۶۔ جین دھرم کا تعارف مفتی محمد سرور فاروقی
۱۷۔ ہندو مذہبی کتابوں کا مختصر تعارف مفتی محمد سرور فاروقی
۱۸۔ ہندوازم تعارف و تعاقب مولانا عبدالحمید نعمانی
۱۹۔ ہندتو اور راشٹر واد مولانا عبدالحمید نعمانی

شعبہ دعوت جماعت اسلامی ہند: جماعت اسلامی ہند کا شعبہ دعوت جماعت اسلامی کی تاسیس (۱۹۴۱ء) کے دن سے متحرک ہے اور جماعت اسلامی نے اس جانب خصوصی توجہ دی ہے۔ اس سلسلے میں لٹریچر کی تیاری جماعت کا اہم کام ہے۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں میں ترجمہ قرآن شعبہ دعوت کا ناقابل فراموش کام ہے۔ اس کے علاوہ اردو، ہندو اور انگریزی تینوں زبانوں میں دعوتی لٹریچر تیار ہوا ہے۔ مسلمانوں میں دعوتی ذہن سازی کے لیے اردو زبان میں حسب ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں:

۱۔ اسلام کیسے پھیلا؟ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۲۔شہادت حق	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۳۔نبی کریمؐ کی دعوتی سرگرمیاں اور ہماری ذمہ داریاں	متین طارق باغپتی
۴۔مسلمان اور دعوت اسلام	مولانا صدرالدین اصلاحیؒ
۵۔دعوت حق اور غیر مسلم	متین طارق باغپتی
۶۔تحریک اسلامی اور برادران وطن	مولانا صدرالدین اصلاحیؒ
۷۔اسلام کی دعوت	مولانا سید جلال الدین عمری
۸۔اسلام ایک دین دعوت	مولانا سید جلال الدین عمری
۹۔غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	مولانا سید جلال الدین عمری
۱۰۔دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار	مولانا امین احسن اصلاحیؒ
۱۱۔دعوت دین اور اسلام کی امتیازی خصوصیات	محمد اقبال ملا
۱۲۔دعوتی کاموں کے لیے خطوط کار	محمد اقبال ملا
۱۳۔دعوت کی منصوبہ بندی	محمد اقبال ملا
۱۴۔اسلام۔غلط فہمیوں اور اعتراضات کا ازالہ	محمد زین العابدین منصوری

جذبۂ دعوت کی آبیاری کے ساتھ مطالعۂ مذاہب پر بھی گراں قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

۱۔اوتارواد اور رسالت (ایک تقابلی مطالعہ)	ڈاکٹر محمد احمد
۲۔چند ہندوستانی مذاہب	مولانا محمد فاروق خاں
۳۔ہندومت: ایک تعارف	حافظ محمد شارق
۴۔بدھ مت: ایک مطالعہ	حافظ محمد شارق
۵۔ہندومت: تاریخ اور فرقے	حافظ محمد شارق
۶۔ہندومت: ایک تجزیاتی مطالعہ	حافظ محمد شارق

ہندی زبان میں اسی کے ساتھ شعبۂ دعوت سے ہندی اور انگریزی میں چالیس سے زائد اہم فولڈر شائع ہوئے ہیں۔جن میں اسلام کا تعارف، غلط فہمیوں کا ازالہ، دین کی دعوت اور تبلیغ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ برادران وطن میں اسلام کے صحیح تعارف کے لیے ہندی زبان میں خاصی ویڈیوز تیار کی گئی ہیں۔دعوت کا کام کرنے والے افراد کے لیے شعبۂ دعوت کی جانب سے مذاہب کا تعارف پر لیکچرس

سریز ریکارڈ کی گئی ہیں۔ دعوتی میدان میں سرگرم داعی حضرات کے لیے ان سے استفادہ بہت مفید ہوگا۔

اس وقت ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم مدعو قوم کو یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ مسلمان آپ کے حریف نہیں۔ برادران وطن کی اکثریت ہمیں اپنا حریف سمجھتی ہے۔ انھیں یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہم آپ کے ہمدرد اور خیر خواہ ہیں۔ ہم آپ کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ مدعو قوم کی حریفانہ ذہنیت ختم کیے بغیر ہندوستان میں دعوتی کام میں بڑی کامیابی ناممکن ہے۔ اس کے لیے ہمیں برادران وطن سے حسن سلوک، اجتماعی کاموں میں ان کے ساتھ شرکت اور ملکی وسماجی مسائل کے حل کے سلسلے میں ان کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

مراجع ومصادر

۱۔ دعوت دین اور اس طریقہ کار، مولانا امین احسن اصلاحی، مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۴

۲۔ اسلام کی دعوت، مولانا سید جلال الدین عمری، مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص: ۳۱

۳۔ صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل، کتاب احادیث الانبیاء، باب ذکر عن بنی اسرائیل، حدیث: ۳۴۶۱

۴۔ دعوت اسلام اقوام عالم اور برادران وطن کے درمیان، پروفیسر محسن عثمانی، مطبوعہ: الفاروق پبلکیشنز، اے پی انڈیا، ۲۰۱۸ء ص: ۲۷۶

۵۔ دعوت مسلم ہندوستانیوں کی اولین ترجیح، خان یاسر مطبوعہ: وہائٹ ڈاٹ کام، ۲۰۲۰ء، ص: ۲۵۔۲۶

۶۔ دعوت دین اور اس کا طریقہ کار ص ۲۰

۷۔ مختصر منہاج القاصدین، علامہ ابن قدامہ مقدسی، مطبوعہ: مکتبہ دار البیان، ۱۹۷۸ء، کتاب شرح عجائب القلوب: ص ۱۴۸

۸۔ اسلام زندہ باد، مرتب عبد المجید قریشی، ص: ۱۵

سفرِ ہجرت اور صحابیات

ثمرہ یعقوب فلاحی

ہجرت معروف معنوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک دین کی حفاظت اور ایمان کی سلامتی کی خاطر سفر کرنے کو کہتے ہیں۔عہد نبوی میں دو ہجرتیں مشہور ہیں۔ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ۔ہجرت حبشہ دو دفعہ پیش آئی جب کہ ہجرت مدینہ صرف ایک دفعہ۔

ہجرت قربانی کی ایک عظیم ترین صورت ہے۔ایک فرد اپنے محبوب خاندان، گاؤں، علاقہ اور ملک چھوڑ کر رب ذوالجلال کے لئے ایک ایسی دنیا کا سفر کرتا ہے جس کے بارے میں اس کو کسی قسم کا تجربہ نہیں ہوتا۔ وہاں کے لوگ اس کے لئے اجنبی ہوتے ہیں، سارا معاشرہ اس کے لیے نیا ہوتا ہے لیکن خدا کی رضا کے لیے وہ یہ ساری مشکلات برداشت کرتا ہے۔یقیناً ہجرت ایک مضبوط ایمان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

جب ہم عہد نبوی کی ہجرتوں کو دیکھتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین صحابیات نے بھی ایمان کی سلامتی کے لیے اس راہ وفاء کو اختیار کیا اور اس راہ کی تمام مشکلات کو برداشت کیا۔

عہد مکی میں جور وستم کا آغاز چوتھے سال کے درمیان یا آخر میں شروع ہوا تھا۔ابتداء سختیاں کم تھیں لیکن دھیرے دھیرے یہ بڑھتی چلی گئیں یہاں تک پانچویں سال تک اپنے شباب کو پہنچ گئیں اور مسلمانوں کے لیے ایمان بچانا مشکل نظر آنے لگا۔اس مشکل وقت میں قرآن نازل ہو رہا تھا جس میں اہل ایمان کو واضح اشارات دیے گئے کہ اللہ کی زمین وسیع ہے۔

آپ ؐ کو معلوم تھا کہ اصحمہ نجاشی شاہ حبش ایک عادل بادشاہ ہے، وہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔آپ ؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے ایمان کی سلامتی کی خاطر حبشہ ہجرت کر جائیں۔طے شدہ پروگرام کے مطابق رجب ۵/نبوی میں صحابہ کے پہلے گروہ نے ہجرت کی۔اس گروہ میں بارہ (۱۲) مرد اور چار (۴) خواتین بھی تھیں۔حضرت عثمان بن عفان ؓ اس قافلے کے امیر تھے، جن کے ہمراہ آپ ؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہ بھی

تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے بعد یہ پہلا گھرانہ ہے، جس نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔

پہلی کامیاب ہجرت حبشہ سے کفار مکہ کا ظلم مسلمانوں پر اور بڑھ گیا۔ مجبوراً آپؐ نے صحابہ کو پھر ہجرت حبشہ کا مشورہ دیا۔ آپؐ کے مشورے کی تعمیل میں اس دفعہ ۸۲/مردوں اور ۱۸/خواتین نے ہجرت کی۔ صنف نازک ہونے کے باوجود کسی خاتون صحابیہ کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہ آئی۔

مہاجر خواتین میں ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیانؓ بھی تھیں، جنہوں نے اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ ہجرت کی تھی۔ عبید اللہ بن جحش وہاں جا کر مرتد ہوگئے اور عیسائیت اختیار کر لی اور وہیں انتقال کر گئے۔ لیکن ام حبیبہ اپنے دین اور اپنی ہجرت پر قائم رہیں۔ بعد میں آپؓ حضور پاک کی زوجیت میں آگئیں۔

عہد نبوی کی سب سے بڑی ہجرت، ہجرت مدینہ ہے، جس کا حکم تمام اہل ایمان مرد و خواتین کو دیا گیا تھا۔ جن مصائب و مشکلات سے مرد حضرات دوچار ہوئے ان سب آلام سے خواتین بھی دوچار ہوئیں۔

سب سے پہلے مہاجر حضرت ابوسلمہ تھے۔ انکی ہجرت کا واقعہ بڑا دردناک ہے۔ ہجرت کے سفر میں ان کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ جب انہوں نے روانہ ہونا چاہا تو ان کے سسرال والے سامنے آگئے اور ان کی بیوی کو روک لیا۔ اس پر ابوسلمہ کے گھر والوں کو تاؤ آگیا اور ان کی بیوی ام سلمہ سے انکے بچے کو چھین لیا۔ چھینا جھپٹی میں بچے کا ہاتھ تک اکھڑ گیا اور ابوسلمہ کے گھر والے اس کو اپنے پاس لے گئے۔ ابوسلمہ نے تنہا مدینہ کا سفر کیا۔ اس کے بعد ام سلمہ کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی روانگی اور اپنے بچے سے محرومی کے بعد روزانہ صبح صبح ابطح (جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا) پہنچ جاتیں اور شام تک روتی رہتیں۔ اسی حالت میں ایک سال گزر گیا۔ بالآخر ان کے گھرانے کے کسی آدمی کو ترس آگیا اور اس نے کہا کہ اس بیچاری کو کیوں نہیں جانے دیتے؟ اسے خواہ مخواہ اس کے شوہر اور بیٹے سے جدا کر رکھا ہے۔ اس پر ام سلمہ سے ان کے گھر والوں نے کہا کہ اگر تم چاہو تو اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ۔ حضرت ام سلمہ نے بیٹے کو اس کے ددھیال والوں سے واپس لیا اور مدینہ چل پڑیں۔ اللہ اکبر! پانچ سو کیلومیٹر کی مسافت کا سفر اور ساتھ میں کوئی مخلوق نہیں۔ جب تنعیم نامی ایک مقام پر پہنچیں تو عثمان بن طلحہ مل گئے۔ انہوں نے قباء کی بستی تک پہنچا دیا اور کہا کہ اسی بستی میں تمھارا شوہر ہے، چلی جاؤ۔ اس طرح کے واقعات سیرت میں کئی ایک مل جائیں گے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابیات نے دین کی خاطر سفر ہجرت جیسی مشکل منزل کو کس طرح پار کیا۔

ہجرت مدینہ کے باب میں نبی آخر الزماں ﷺ کی ہجرت سب سے زیادہ سبق آموز اور اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ایسا سفر تھا جس میں قدم قدم پر نبی کریم ﷺ کے خون کے پیاسے آپ کو تلاش کر رہے تھے، لیکن آپ ؐ کی کامیاب حکمت عملی اور نصرت خداوندی نے کفار کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اس سفر کے دو مواقعوں پر حضرت اسماء بنت ابی بکر کی ذہانت اور نبوی تربیت نے اہم رول ادا کیا۔

جب کفار مکہ نے صبح آپ ؐ کو نہیں پایا تو غصے میں ابو جہل حضرت ابو بکر صدیق کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو حضرت اسماء نے دروازہ کھولا۔ ابو جہل نے ان سے ان کے والد حضرت ابو بکرؓ اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نفی میں جواب دیا تو ابو جہل نے اس زور کا تھپڑ مارا کہ ان کے کان کی بالی گر گئی۔ لیکن دشمن خدا کچھ بھی معلوم کرنے میں ناکام رہا۔

غار ثور میں منصوبہ کے مطابق تین دن قیام کے بعد مدینہ روانگی کا وقت آیا تو اسماء بنت ابی بکرؓ زادِ سفر لے کر آئیں، مگر اس میں لٹکانے والا بندھن بھول گئیں۔ جب روانگی کا وقت آیا اور حضرت اسماء نے توشہ لٹکانا چاہا تو تو دیکھا کہ اس میں بندھن ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنا پٹکا (کمر بند) کھولا اور دو حصوں میں چاک کر کے ایک میں توشہ لٹکا دیا اور دوسرا کمر میں باندھ لیا۔ اسی وجہ سے ان کا لقب 'ذات النطاقین' پڑ گیا۔

غور کیا جائے تو یہ ایسا وقت تھا، جہاں ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی کے سنگین نتائج برآمد ہوتے۔ لیکن ایسے شدید ترین حالات میں بھی ایک خاتون نے اعصاب پر کنٹرول اور ایمان واستقامت کا کا ثبوت دے کر قیامت تک امت مسلمہ کی خواتین کے لیے نمونہ قائم کیا۔

مسلم خواتین اصلاحی کوششوں کے ساتھ ساتھ غلبۂ اسلام کی عملی جدوجہد کی کوششوں میں بھی فعال کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اسلامی تاریخ ایسی بہادر اور جانباز خواتین سے بھری پڑی ہے۔

اسلامی سرمایے کی تحقیق واشاعت میں ہندوستانی فضلاء کا کردار

تحریر: مولانا محمد عزیر شمس سلفی
مترجم: محمد صادر ندوی

ہندوستان میں اسلامی ذخائر اور عربی سرمایے کی نشر واشاعت کا سلسلہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر سے ہوا جب کہ کلکتہ میں لیٹر پریس پرنٹنگ (Letter Press Printing) کا قیام ہوا۔ ابتدائی دور میں وہاں سے جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں ۱۷۹۳ء میں علامہ سجاوندیؒ کی السراجیة فی الفرائض، ۱۸۰۷ء میں امام مرغینانیؒ کی الهداية، ۱۸۳۲ء میں الفصول الابقراطية، ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۲ء الف ليلة وليلة، ۱۸۵۳ء میں علامہ طوسیؒ کی الفهرست، ۱۸۵۶ء میں علامہ سیوطیؒ کی تاریخ الخلفاء، ۱۸۵۶ء میں علامہ ابن حجرؒ کی الاصابة فی تمييز الصحابة اور ان کے علاوہ دیگر علوم وفنون کی مراجع کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ان تمام کتب کی تصحیح و تعلیق کا کام مولوی کبیر الدین احمدؒ، مولوی سلیمان غلام مخدومؒ، مولوی عبداللہؒ، مولوی عبدالحقؒ، غلام قادرؒ، اور محمد وجیہ الحقؒ جیسے مایہ ناز سپوت نے انجام دیا۔

اس کے بعد پے در پے ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی کئی پبلشرز قائم ہوگئیں، جہاں پتھروں پر کتابوں کی چھپائی ہوتی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ میں مطبع منشی نولکشور بھوپال میں، مطبع صدیقی اور مطبع سکندری دہلی میں، فاروقی کتب خانہ و مطبع انصاری اور مطبع احمدی کانپور میں، مطبع نظامی آرہ میں، مطبع خلیلی امرتسر میں، دارالکتب والسنۃ بمبئی میں، مطبعۃ نخبۃ الاخبار کے نام سے متعدد پریس قائم ہوئی۔ وہاں سے جو کتابیں شائع ہوئیں ان کی تفصیلات میں جانے کے لیے کئی صفحات درکار ہیں۔ مذکورہ بالا پبلشرز کا علوم شریعت، زبان وادب، تاریخ، طب، فلسفہ اور دیگر کتابوں کی ترویج واشاعت میں زبردست کردار رہا ہے۔ ان مطبوعات پر بڑے بڑے علماء مامور تھے جو متون کی تصحیح و چھان بین پر توجہ دینے کے ساتھ کتاب کی پیچیدہ عبارتوں پر حاشیہ ڈالتے اور مضامین کی تشریح وتوضیح اور مشکل الفاظ پر اعراب لگاتے تھے۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد نے شروع ہی سے مختلف علوم وفنون میں مصادر ومراجع کی تلاش وجستجو اور مخطوطات کو ڈھونڈ کر ان کی فوٹو کاپی محفوظ کرنے کے ساتھ ان کی تحقیق واشاعت پر توجہ دی، یہ کام ایک کمیٹی کے تحت انجام پاتا تھا جس کے صدر مولانا محمد ہاشم ندوی تھے جن کی 'تذکرۃ النوادر' ہے۔ انھوں نے

نشر واشاعت کی ایک مستقل کمیٹی تشکیل دی، ملک و بیرون ملک کے علماؤ محققین کے علاوہ مستشرقین اور عربی زبان سے شغف رکھنے والے فضلاء سے رابطہ کیا۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد مشرقی دنیا کی پہلی اکیڈمی ہے جس نے اہم اسلامی سرمایے کی ترویج واشاعت پر اس قدر توجہ دی کہ شاید ہی دنیا کا کوئی مکتبہ وہاں کی مطبوعات سے خالی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کی مطبوعات کو دنیا کے ہر کونے میں کافی اعتبار اور مقام حاصل ہے جن سے اسلامیات کا کوئی بھی محقق یا ریسرچ اسکالر بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اس کی شہرت مزید کچھ کہنے کے لیے کافی ہے۔

ذیل میں اس میدان میں ان ہندوستانی علماء کی انفرادی خدمات کا تذکرہ کیا جائے گا، جنھوں نے اپنی زندگی عربی سرمایہ کی تحقیق واشاعت کے لیے وقف کردی۔ عربی زبان کی محبت اور اس کی خدمت کا جذبہ جن کی رگوں میں پیوست تھا اور پھر اس راہ میں اپنی ساری توانائی صرف کردیں۔ راقم کی تحقیق کے مطابق ان علماء کی تعداد تقریبا ۵۰ سے زائد ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنھوں نے عرب یا مستشرقین کے منہج سے متاثر ہوئے بغیر اپنے لیے ایک نیا منہج اپنایا۔ جب کہ دوسرے گروہ نے مغرب کی پیروی کی اور اس میں کچھ چیزوں کا اضافہ کیا۔ تیسرا گروہ جدید عربی جامعات اور یونیورسٹی کے فارغ تھا اور اس نے وہیں کے منہج کو اپنایا۔ ان کی تقسیم علوم وفنون کے اعتبار سے بھی کی جاسکتی ہے۔ ایک طبقہ نے مشرقی علوم یعنی (تفسیر، حدیث اور فقہ) پر توجہ دی جب کہ دوسرے نے زبان وادب اور شعروشاعری کو اپنی تحقیق کا میدان بنایا اور تیسرے طبقہ نے تاریخ، فلسفہ اور طب وغیرہ کی کتابوں میں اپنی دلچسپی دکھائی۔ اس سرسری گفتگو میں ہمارے لیے ان تمام علماء کی تحقیقی خدمات کا جائزہ لینا بہت مشکل ہے۔ ہم صرف ان چند محققین کے تذکرہ پر اکتفا کریں گے، عربی سرمایے کی بحث وتحقیق اور مصادر ومراجع کی کتابوں کو پہلی مرتبہ زیور طبع سے آراستہ کرنے کی وجہ سے جن کا چرچہ چہار دانگ عالم میں پھیلا ہوا ہے اور جن کی شہرت وناموری دنیا کے گوشوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ میں نے ان میں سے دس ایسی شخصیات کا انتخاب کیا ہے جن میں سے بعض نے حدیث اور اصول حدیث کی کتابوں کی تحقیق کی ہے، بعض نے زبان وادب اور شعر کی کتابوں پر کام کیا ہے اور بعض نے علم تاریخ اور علم انساب پر کام کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان کی کاوشوں کے چند نمونے پیش کرتے ہیں جن سے ان کی شخصیت کے نمایاں اور جداگانہ پہلو اجاگر ہوجائیں گے۔

علامہ شمس الحق عظیم آبادی: (م ۱۹۱۱ء بمطابق ۱۳۲۹ھ)

نامور محدث شمس الحق عظیم آبادی کا شمار ان شخصیات میں ہوتا ہے جو سب پہلے کتب حدیث کی طرف متوجہ ہوئے۔ بھاری رقم خرچ کرکے بے شمار کتابیں جمع کیں جن میں مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جو ذخیرہ بعد میں خدا بخش لائبریری کی شکل اختیار کرگیا۔ موصوف نے پہلی مرتبہ ہندوستان سے سنن دار قطنی کو شائع کیا

اور **التعلیق المغنی** کے نام سے ایک قیمتی مقدمہ لکھا، جس میں احادیث کی تخریج اور سند پر کلام کیا ہے۔ اس کے علاوہ سنن ابوداؤد پر بھی ان کی گراں قدر خدمت ہے، چنانچہ اس کے گیارہ قلمی نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کی تحقیق کی ہے، تحفۃ الاشراف اور دیگر قلمی مصادر کو سامنے رکھ کر لـؤ لـؤ ی کی سند کو دوسرے راویوں سے الگ کیا ہے۔ سنن ابو داؤد کے مختلف نسخے آپس میں گڈ مڈ تھے ان کے درمیان فرق کیا، زائد احادیث کی تحقیق کے بعد ان کی وضاحت کی ہے۔ پھر **عون المعبود علی سنن ابی داؤد** کے نام سے ایک متوسط شرح لکھی جو علمی حلقوں میں رائج ہے۔ انھوں نے **غایة المقصود** کے نام سے سنن ابوداؤد کی ایک اور شرح لکھی جو پہلے کی نسبت بہت طویل ہے۔ ان کی زندگی میں اس کی صرف ایک ہی جلد شائع ہوسکی اور وفات کے بعد مزید دو جلدیں۔ اگر اس کی تکمیل ہو جاتی تو یہ شرح بتیس ۳۲ جلدوں پر مشتمل ہوتی۔ اس شرح کے مقدمہ میں پہلی مرتبہ **رسالة ابی داؤد الیٰ اهل مکة** کے نام سے اہل مکہ کے نام امام ابوداؤد کی مایہ ناز تحریر بھی شائع ہوئی ہے۔ اسی طرح منذری کی **مختصر السنن** اور ابن القیم کی **تهذیب السنن** کا ایک حصہ بھی اس شرح کے حاشیہ میں شائع ہوا ہے۔

عظیم آبادی نے اس کے علاوہ دوسری کتابوں کی بھی اشاعت کی ہے جیسے امام بخاری کی خلق افعال العباد، علامہ سیوطی کی **اسعاف المبطأ برجال المؤطأ** عظیم محدث حسین بن محسن انصاری کے بعض رسائل۔ میں نے موصوف کے ان تمام کارناموں کا تفصیلی تعارف اپنی کتاب 'حیاة المحدث شمس الحق عظیم آبادی و اعماله' مطبوعہ بنارس میں کیا ہے۔

شیخ عبدالتواب ملتانی (۱۹۶۶ء)

وہ حضرات جنھوں نے اسباب و وسائل کی عدم فراوانی کے باجود احادیث کی کتابوں کی نشر و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ان میں علامہ عبدالتواب ملتانی ہیں۔ انھوں نے پہلی بار مصنف ابن ابی شیبہ کی تین جلدیں شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ محمد بن نصر مروزی کی **مختصر قیام اللیل وقیام رمضان وقیام الوتر** جس کی تلخیص مقریزی نے کی ہے۔ اسی طرح باغندی کی **مختصر عمر بن عبد العزیز** ابن القیم کی **تحفة المودود بأحکام المولود** حاشیۃ السندی علی صحیح مسلم اور دیگر کتابوں کو شائع کیا ہے جن کی تعداد بیس کے قریب ہے، یہ ساری کتابیں پتھر کی پریس میں چھپی۔ موصوف نے ان کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ان کی تصحیح وتعلیق بھی کی اور کتب حدیث، اسماء الرجال اور تاریخ سے متعلق قیمتی نوٹ بھی چڑھائے ہیں۔

شیخ عبدالصمد شرف الدین (م ۱۹۹۶ء بمطابق ۱۴۱۶ھ)

آپ کی شہرت بطور خاص امام مزی کی ''تحفۃ الاشراف'' کی ۱۴ جلدوں میں اشاعت کی وجہ سے

ہے جو اپنے آپ میں ایک عظیم علمی خدمت ہے۔ اس کتاب سے واقف ہر شخص کو معلوم ہوگا کہ اس کتاب میں ایسی خصوصیات موجود ہیں جن سے دیگر مطبوعات خالی ہیں۔ مثلاً: راویوں کے طبقات کی وضاحت کے لیے ایک، دو یا تین اسٹار (☆، ☆☆، ☆☆☆) کا استعمال۔ اسی طرح مخصوص طریقہ پر حروف کو چھوٹا یا بڑا کر کے لکھنا، علامات ترقیم کا اہتمام، کتب حدیث کے لیے رموز کی وضع، اصل متن کے بیچ قوسین کے درمیان دوسری احادیث کی کتابوں میں موجود باب سے متعلق احادیث کی نشاندہی کتاب اور باب نمبر کے ساتھ۔ دشواری کے موقع پر حاشیہ میں علامہ ابن حجر کی **النکت الظراف علی الاطراف** کا حوالہ۔ بعض جگہوں پر غلطی، تبدیلی، یا حذف کی نشاندہی کرنے کے لیے حاشیہ چڑھانا۔ احادیث کی تمام کتابوں اور ان کے ابواب کو مستقل جلد میں بیان کرنا تا کہ ان سے رجوع کرنا آسان ہو۔ **تحفة الاشراف** کی تحقیق کے درمیان ہی امام نسائی کی **السنن الکبریٰ** (امام مزی نے تحفۃ الاشراف میں السنن الصغریٰ کے بجائے جس پر اعتماد کیا تھا) کے تمام قلمی نسخوں کو جمع کر کے اس کی تحقیق کی اور تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔

شیخ عبدالصمد کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتابوں سے خاص شغف تھا، انھوں نے پہلی مرتبہ ان کی اہم کتابوں '**الرد علی المنطقیین، مجموعة تفسیر شیخ الاسلام لست سور، قاعدة فی انواع الاستفتاح فی الصلاة**' کی اشاعت کی ہے۔ ان کتابوں میں موصوف کے قیمتی حاشیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ابن تیمیہ کے علمی سرمایے سے کس قدر شغف تھا۔ اور جن موضوعات پر لکھا ہے ان میں کس قدر مہارت تھی۔ آپ کے سامنے اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے: حضور ﷺ کے بیٹے ابراہیم کی وفات کے دن سورج گرہن کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اس واقعہ کی تاریخ کے سلسلہ میں ابن تیمیہ نے واقدی اور دیگر فقہاء سے سخت اختلاف کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس کا دارومدار ماہرین فلکیات کے حساب اور اندازہ پر ہے، لہٰذا جو رائے ان کے حساب کے مخالف ہوگی وہ قابل قبول نہیں ہوگی۔ چنانچہ محقق موصوف نے فلکیات کے ماہر ایک ہندو عالم سے اس معاملہ میں رجوع کیا اور ان سے فلکیات کے حساب سے حضور ﷺ کے زمانہ میں سورج گرہن کی تاریخ معلوم کی اور جب اس ماہر نے اس کا حساب لگایا تو ابن تیمیہ کی رائے ہی قوی نظر آئی اور واقدی اور ان کے ہم نواؤں کی تحقیق غلط ثابت ٹھہری۔

محدث اعظم حبیب الرحمٰن اعظمیؒ (م ۱۹۹۲ء بمطابق ۱۴۱۲ھ)

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا شمار ان نامور محدثین میں ہوتا ہے جنھوں نے علم حدیث کی نشرو اشاعت میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے احادیث کے ایک بڑے ذخیرہ کی تحقیق کے ساتھ ان پر مفید

علمی حواشی چڑھائے ہیں۔ وہ کتابیں جن پر آپ کا تحقیقی کام ہوا ہے مندرجہ ذیل ہیں: مسند الحمیدی، سعید بن منصور کی 'السنن والآثار' ۱۱ جلدوں میں مصنف عبدالرزاق، ۴ جلدوں میں مصنف ابن ابی شیبہ، ابن المبارک کی **الزهد والرقاق** ابن حجر کی **المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة العالیة**، ہیثمی کی **کشف الاستار عن زوائد مسند البزار**، ابن الاثیر کی **تتمة جامع الاصول** (یہ اس کتاب کی تیسری فصل تھی جو شائع ہونے سے رہ گئی تھی)۔ کتب حدیث سے ان کے شغف اور دلچسپی کا ایک عجیب واقعہ ہے کہ انھوں نے **کشف الاستار** جو ۸۰۷ھ کی تصنیف ہے کا ایک قلمی نسخہ کسی صاحب کے پاس پایا تو ان صاحب نے اس کے بدلے جتنی رقم کا مطالبہ کیا موصوف نے وہ رقم ادا کر کے وہ نسخہ ان سے حاصل کر لیا، اسی طرح 'مسند الامام الحارث بن ابی اسامۃ' کا ایک قلمی نسخہ کسی صاحب کے پاس ملا تو اس پورے نسخہ کو اپنے ہاتھ سے نقل کر لیا تا کہ آئندہ اس پر تحقیقی کام کیا جا سکے لیکن اس سے قبل ہی ان کی وفات ہوگئی۔

تحقیق وتعلیق میں ان کا منہج

تحقیق وتعلیق میں ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ نص کتاب (اصل عبارت) کو سامنے موجود نسخوں اور دوسرے مراجع سے ملاتے ہیں۔ احادیث وآثار کی اختصار کے ساتھ تخریج کرتے ہیں۔ اور احادیث کے ان مصادر اور کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں جن سے وہ حدیث ماخوذ ہے۔ نص میں اگر کسی قسم کی غلطی یا وہم ہو تو اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ کتاب کے مختلف نسخوں کے درمیان الفاظ وغیرہ کے باریک فرق کے بجائے صرف اہم عبارتوں کو ملاتے ہیں۔ اغلاط کی تصحیح، عبارت کی درستی میں انتھک کوشش کرتے ہیں، لیکن بعض نسخوں کے نہایت ہی قدیم اور بوسیدہ ہونے کی وجہ سے بعض کتابوں میں سند اور متن میں غلطیاں رہ گئی ہیں بالخصوص مصنف عبد الرزاق اور مسند الحمیدی میں۔ البتہ آخر الذکر کا ایک قدیم نسخہ جو 'مکتبۂ ظاھریۃ' سے شائع ہوا ہے جب ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے بعض اغلاط کا استدراک کر کے کتاب سے ملا دیا، لیکن تمام اغلاط کا استدراک نہیں کر پائے۔ نہ ان حواشی کو بدل پائے جن کے حروف پہلے ہی ثبت ہو چکے تھے۔ بہر حال موصوف علیہ الرحمۃ ان شاء اللہ اجر کے مستحق قرار پائیں گے۔

شیخ ابوالوفاء افغانی (م ۱۹۷۵ء بمطابق ۱۳۹۵ھ)

شیخ ابوالوفاء افغانیؒ نے حیدر آباد کو اپنا وطن بنایا اور وہیں **احیاء المعارف العثمانیة** کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی تا کہ متقدمین علمائے احناف کے علمی سرمایے کی نشر واشاعت کی جا سکے۔ انھوں نے جن کتابوں کو

چھان بین کے بعد نشر کیا ان میں اہم یہ ہیں: امام ابو یوسف کی **کتاب الآثار** ،**اختلاف ابی حنیفة و ابن ابی لیلیٰ**،**الرد علی سیر الاوزاعی**،امام محمد کی **کتاب الآثار**،**کتاب الاصل** امام طحاوی کی **مختصر الطحاوی** امام سرخسی کی **اصول السرخسی** الصدر الشہید کی **شرح کتاب النفقات للخصاف**۔

منہج تحقیق

تحقیق میں ان کا منہج یہ ہے کہ وہ احادیث وآثار اور مسائل کو ان کے اصل مراجع سے لیتے ہیں، پھر اس کا نسخہ تیار کرتے ہیں، بسا اوقات یہ نسخہ بہت طویل ہوجاتا ہے۔امام محمدؒ کی کتاب الآثار اور کتاب الاصل کے حاشیے میں انھوں نے اسی طرز پر بہت سی معلومات جمع کردی ہیں؛لیکن اسی منہج پر کتاب الاصل کی تحقیق کا پورا کام نہیں کر سکے۔مزید برآں جن کتابوں کی انھوں نے تحقیق کی ہے ان میں طویل اور قیمتی مقدمے لکھے ہیں، جن میں کتاب کی اہمیت، مؤلف کی مختصر سوانح حیات ذکر کرنے کے علاوہ جن قلمی نسخوں کا سہارا لیا ہے ان کی خوبیاں بیان کی ہیں۔

ابوالوفا افغانی کی (تمام خدمات کے اعتراف کے باوجود) جس مسئلہ میں گرفت کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے **اختلاف ابی حنیفة و ابن ابی لیلیٰ** اور **الرد علی سیر الاوزاعی** کا پورا مواد امام شافعیؒ کی **کتاب الأم** سے اخذ کیا ہے،اور اس کتاب میں امام شافعیؒ نے امام ابو یوسفؒ پر جو رد کیا ہے اس کو انھوں نے حذف کردیا اور اس کی وضاحت بھی نہیں کی، نہ ہی مقدمہ میں ان دونوں کتابوں کے قلمی نسخے کا تذکرہ کیا باوجود یہ کہ مکتبات میں یہ دونوں کتابیں مفقود ہیں،علمی امانت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ ذکر کردیا جاتا کہ یہ کتابیں امام شافعیؒ کی کتاب الام سے ماخوذ ہیں،اسی طرح امام شافعی نے ان کتابوں کے مسائل پر جو تبصرہ کیا ہے اس کو ذکر کیا جاتا، پھر حاشیہ میں اس پر بحث کی جاتی، (لیکن ایسا نہیں ہوا، جو ان کی گرفت کا سبب بنا)۔

زبان وادب اور تاریخ وانساب کے ماہرین

حدیث اور فقہی خدمات کے لحاظ سے ہم انھی پانچ شخصیات کے تذکرہ پر اکتفا کرتے ہیں۔مزید ان پانچ شخصیات کی طرف منتقل ہوتے ہیں جنھوں نے زبان وادب،اور تاریخ وانساب وغیرہ میں شہرت پائی،وہ درج ذیل ہیں:

علامہ عبدالعزیز میمنیؒ (و:۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء)، علامہ محمد بن یوسف سورتیؒ (و:۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء)، مولانا امتیاز علی عرشیؒ (و:۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء)، ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ (و:۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء)، شیخ ابومحفوظ الکریم معصومیؒ (و:۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء)۔

علامہ میمنی کی شخصیت علمی حلقوں میں بحث وتحقیق کے سلسلے میں مشہور ومعروف ہے، زبان وادب میں ان کی تحقیق کی ہوئی کتابوں کی تعداد تقریبا تیس ۳۰ اور ایک رسالہ ہے۔انھوں نے ملک وبیرون ملک، ترکی، اور بلاد

عربیہ کے مکتبات میں موجود نادر مخطوطات سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ ان کے اہم کارناموں میں سے ایک کارنامہ یہ ہے کہ ابوعبید البکری کی کتاب 'اللآلی شرح امالی القالی' کی تحقیق وتعلیق کی اور اس کا نام 'سمط اللآلی' رکھا، اس کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تحقیقی معیار کے اعتبار سے کوئی بھی کتاب اس کے برابر نہیں ہے، جیسا کہ مشہور محقق محمود محمد شاکر نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس میں اشعار کی تخریج باریکی کے ساتھ علمی انداز میں ہوئی ہے، شعر کی نسبت اور روایت کے اختلاف کا ذکر کیا گیا ہے، شعراء کے نسب ناموں، ان کی سوانح پر لکھی گئی کتابوں میں جو غلطیاں اور وہم ہے اس کی وضاحت ہے، ساتھ ہی کتاب میں موجود اخبار العرب، قصص العرب، ایام العرب (عرب کی جنگیں)، امثال العرب کے اصل مراجع کی طرف رہ نمائی کی گئی ہے، بہت سی چیزوں میں ابوعبید بکری سے اختلاف کرتے ہوئے امام قالی کی طرف سے مدلل براہین کے ذریعہ دفاع کیا گیا ہے۔ کتاب میں ان کے جو حواشی ہیں، ان میں بہت سی قیمتی معلومات جمع ہیں جن کے ذکر کا یہ محل نہیں ہے۔ عربی زبان وادب میں ان کی مہارت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے ''اللآلی'' پر حاشیہ چڑھایا ہے، اور اسی نہج پر ''الامالی'' کے حواشی کی تشریح کی ہے اور کتاب کے آخر میں اپنے حواشی کو ایڈ کر دیا ہے، کیوں کہ بکری نے صرف الامالی کی شرح کی ہے۔ پھر جدید طرز پر **سمط اللآلی** کی فہرست مرتب کی، جس سے کتاب میں مذکور اشعار، شعراء، تراجم اور امثال کی وضاحت ہوتی ہے۔ سمط اللآلی کے بعد ان کا دوسرا کارنامہ علی بن حمزۃ بصری کی کتاب **التنبیہات علی اغالیط الرواۃ** کی تحقیق کا کام ہے، اس کے حواشی میں انھوں نے مؤلف کی بہت سی باتوں پر سخت اعتراض کیا ہے اور ان کی تردید کی ہے، حالاں کہ لغویین کے یہاں جن امور میں اختلاف ہوتا ان میں علی بن حمزہ کی حیثیت حکم کی ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود میمنی نے ان سے اختلاف کیا ہے اور اپنی بات پر مضبوط دلائل پیش کیے ہیں، جن سے ایک انصاف پسند محقق اچھی طرح مطمئن ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کی آسان فہرست تیار کرنے کے بجائے پیچیدہ فہرست تیار کی تاکہ ہر کس وناکس اس پر مسلط نہ ہوسکے، جیسا کہ انھوں نے ''سمط اللآلی'' کی فہرست کے ساتھ کیا کہ اس کے سہارے سمط اللآلی کے حواشی میں بکھرے معلومات کو نکال لیا لیکن اس کی وضاحت نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب (التنبیہات) کی فہرست میں میمنی نے آسانی کے بجائے پیچیدگی سے کام لیا۔

جن کتابوں کی چھان بین کے بعد نشر کیا ان میں **دیوان حمید بن ثور الھلالی، سحیم عبد بنی الحسحاس، القصائد والدواوین المجموعۃ فی الطرائف الادبیۃ**، امام مبرد کی تین کتابیں **:الفاضل، نسب عدنان وقحطان، مااتفق لفظہ واختلف معناہ من القرآن الکریم** قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح دیوان المتنبی میں جو اضافے ہیں ان کو یکجا کیا، ابوالعلاء معری کے گمشدہ اشعار کو مرتب کیا۔

علامہ میمنی کی کتابوں اور خطوط کی تمام تحقیقات 'بحوث وتحقیقات للعامۃ عبدالعزیز میمنی' نامی کتاب میں یکجا ہیں، جو دارالعرب الاسلامی سے شائع ہوئی ہے۔

رہی بات علامہ سورتی کی تو وہ علامہ میمنی کے کلاس فیلو رہے ہیں، بسا اوقات حدیث، رجال حدیث اور علم الانساب میں ان سے فوقیت رکھتے ہیں، وہ میمنی ہی کی طرح دولاکھ عربی اشعار کے حافظ تھے، مخطوطات کے نسخے تیار کرنا اور نایاب کتابوں کو جمع کر کے ان کا مطالعہ کرنا ان کا مشغلہ تھا، انھوں نے ابن درید کی **جمھرۃ اللغۃ**، ابن القطاع کی **الافعال** خطیب بغدادی کی **الکفایۃ** کی تحقیق کی ہے یہ ساری تحقیقات دائرۃ المعارف عثمانیہ سے شائع ہو چکی ہیں، راقم نے بذات خود ابن حزم کی **جوامع السیرۃ** اور دوسری بہت سی کتابوں کا قلمی نسخہ جو موصوف کی تحریر میں ہے معائنہ کیا ہے۔ جس وقت سمط اللآلی منظر عام پر آئی اس وقت ان کے پاس ابن ماکولا کی **الاکمال**، ابن حزم کی **جمھرۃ انساب العرب** اور دوسرے مراجع کی کتابیں موجود تھیں، جن کی مدد سے انھوں نے اس پر زبردست تنقید کی، اور پھر علامہ میمنی سامنے آئے اور ان کا ازالہ کیا، البتہ جو غلطیاں اس میں (سمط اللآلی) رہ گئیں تھیں ان کا اعتراف بھی کیا۔ میمنی کے انتقال کے بعد علامہ سورتی ایک تہائی صدی سے زائد باحیات رہے، اس درمیان جب بھی ان کا شاگردوں کے ہمراہ میمنی کی قبر سے گزر ہوتا تو فرماتے ''یہ علم کے پہاڑ کی قبر ہے'' یقیناً اس جملہ میں ان کے علم وفضل کا بہت بڑا اعتراف ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشیؒ

مولانا امتیاز علی عرشی علامہ عبدالعزیز میمنی کے شاگردوں میں ہیں۔ وہ رامپور کی مشہور رضا لائبریری کے انچارج تھے، جہاں انھوں نے مخطوطات کی فہرست کا کام کیا ہے، وہاں انھیں بہت سے گراں قدر علمی سرمایے سے آگاہی ہوئی، اور پھر ان علمی سرمایوں کے تعارف وتبصرے میں بے شمار تحریریں سپرد قرطاس کیں، جن کی اشاعت اردو میگزین میں ہوئی۔ امام سفیان ثوری کی تفسیر کی تحقیق کے بعد عالم عربی میں ان کی شہرت عام ہوگئی، اس تفسیر کو انھوں نے رضا لائبریری میں موجود بیش بہا نسخہ کو سامنے رکھ کر علمی اور تحقیقی وتنقیدی انداز میں شائع کیا ہے۔ اس تفسیر کا شمار ان قدیم تفاسیر میں ہوتا ہے جو ہم تک پہنچی ہیں۔ موصوف ایک عرصہ تک اس کے مطالعہ میں لگے رہے۔ اس میں انھوں نے آثار وروایات کی تخریج کے ساتھ مؤلف کی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اس تفسیر کی سفیان ثوریؒ کی طرف نسبت کی چھان بین کی (آیا ان کی طرف یہ نسبت صحیح ہے یا نہیں؟)، کتاب میں موجود تمام اشخاص کے تراجم کا ذکر کیا، اسی طرح تمام مطبوعہ اور قلمی مصادر ومراجع کی تاریخی اعتبار سے بالترتیب وضاحت کی ہے جن کی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے علاوہ ازیں تراجم رجال کو کتاب

کے اخیر میں طبقات کے اعتبار سے ذکر کیا ہے۔

دیگر کتابیں جن کی انھوں نے تحقیق کی ہے ان میں **دیوان ابی محجن الثقفی، دیوان الحادرۃ الذبیانی**،ابو عبید کی **الاجناس من کلام العرب**، جاحظ کی **الاخبار**، ابن الانباری کی **مرسوم الخط والمقطوع الموصول**، صاحب بن عباد کی **الامثال السائرۃ من شعر المتنبی**، قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض مطبوعات ہمارے ہندوستان میں مفقود ہیں، اور جب ان کا موازنہ رائج نسخوں سے کیا جائے تو ان کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے، اس لیے کہ استاد عرشی نے کتاب کے نصوص کی چھان بین، حواشی اور فہرست کی ترتیب میں بہت گہرائی سے کام لیا ہے۔ ہمارے ایک محقق و فاضل عزیز محمد اجمل اصلاحی صفحات کے درمیان بکھرے ہوئے ان کی تحقیقات اور ابحاث کو جمع کرنے کا کام کر رہے ہیں تاکہ عرب ممالک کے باشندے ان سے مستفید ہوسکیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

آپ کی شہرت تعارف سے آپ کو بے نیاز کر دیتی ہے، ترکی اور یورپ کے مکتبات میں نایاب مخطوطات کی تلاش و چھان بین ان کا محبوب مشغلہ تھا،سعید بن منصور کی الآثار والسنن کا سراغ انھوں نے ہی لگایا ہے، اسی طرح حضرت ابوھریرہؓ کی مرویات پر مشتمل ھمام بن منبہ کا صحیفہ جو علم الحدیث کی ابتدائی مؤلفات میں سے ہے، کی تحقیق انھوں نے ہی کی ہے۔ سیرت ابن اسحاق کے موجود دو اجزاء کی تحقیق بھی انھوں نے ہی کی ہے۔ ان کے علاوہ جن کتابوں پر کام کیا ہے ان میں بلاذری کی انساب الاشراف، رشید بن زبیر کی الذخائر والتحف ،نعمان بن محمد کی **معدن الجواھر بتاریخ البصرۃ والجزائر** ہیں، دوسرے فضلاء کے اشتراک وتعاون سے جن کتابوں کی تحقیق ہوئی ہے ان میں ابن قتیبہ کی **کتاب الانواء** ابوالحسین بصری کی **المعتمد فی اصول الفقہ**، محمد بن حبیب کی **المحبر** قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ابوحنیفہ دنوری کی کتاب النبات کا جو حصہ مفقود تھا اس کے نصوص کو یکجا کیا ہے، اس کام کے لیے مختلف مراجع کا سہارا لیا بطور خاص زبیدی کی تاج العروس کا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نصوص کے ضبط وتحقیق کے ساتھ ان مصادر کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں جن میں کتاب میں کے مشتملات (اخبار وموضوعات) پہلے سے موجود ہیں؛ لیکن اس میں زیادہ طوالت سے کام نہیں لیتے، ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کتاب صحیح سالم سامنے آئے، اس منہج سے مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ مستثنیٰ ہے، اس میں انھوں نے ہر وثیقہ (عہد نامہ) کے بعد، عربی، فارسی، اردو اور دیگر تمام زبانوں میں موجود اس کے تمام قلمی اور مطبوعہ مصادر کا تذکرہ کیا ہے، اور ان میں جو باریک یا جلی فرق ہے ان کا احاطہ کیا ہے

اوران وثائق سے متعلق دیگر ابحاث وتجزیے کی طرف بھی اشارہ ہے، اسلامی وثائق (عہدناموں) میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان تمام میں موصوف کے اس مجموعہ کے ٹکر کی کوئی کتاب نہیں ہے، گویا انھوں نے ہی سب سے پہلے اس دروازہ کو کھولا پھر لوگ اس میں داخل ہوتے رہے۔ فی الحال راقم ان کے ابحاث ومقالات کو عربی میں جمع کرنے کا کام کررہاہے، اللہ تعالیٰ میرے اس سفر کوآسان کرے۔

ان محققین کی سب سے آخری کڑی شیخ ابومحفوظ الکریم معصومی ہیں جنھوں نے بعض بہت ہی اہم نصوص کی نشرواشاعت کا کام کیاہے جیسے ابن الانباری کی **دیوان الرسمیات وشرح الالفات**، ابوعبدالرحمٰن سلمی کی **مسألة صفات الذاکرین والمتفکرین**، سیدمرتضیٰ زبیدی بلگرامی کے بعض رسائل وغیرہ۔ البتہ ان کی شہرت کی اصل وجہ ان دواوین اورعلمی سرمایوں کی تنقید واستدراک ہے جن کی تحقیق بڑے بڑے محققین نے کی تھی، گویاوہ اپنے اس عظیم کارنامے کے ذریعے انھی محققین کی فہرست میں شامل ہوگئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے امام ذہبی کی **سیر اعلام النبلاء** جودکتورصلاح منجدکی تحقیق سے شائع ہوئی ہے کے تین اجزاء پراستدراک کیاہے، اسی طرح سمط اللآلی، دیوان حمید بن ثور الهلالی، قصیدة العروس جوتینوں علامہ میمنی کی تحقیق سے شائع ہوئی ہیں پرتنقید کی ہے، اس کے علاوہ استاد احمد راتب النفاخ کی تحقیق سے شائع دیوان ابن دمینہ، ڈاکٹرحسین نصارکی تحقیق سے شائع دیوان جمیل بثینہ، ڈاکٹرعزہ حسن کی تحقیق سے شائع دیوان بشربن ابی حازم اوردیوان ابن مقبل کا تجزیہ کیاہے۔

استادمعصومی کواس سلسلہ میں فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے ابوعلی الھجری کی **التعلیقات والنوادر** مطبوع ایشیا اکیڈمی کلکتہ(The Asiatic Academy in Kolkata) کا دنیاکے سامنے تعارف کرایاہے، ان کے اس عظیم کارنامہ کوعلامہ محمد جاسر نے سراہاہے۔ برادرعزیز محمد اجمل اصلاحی نے ان کے ابحاث ومقالات کودوجلدوں میں جمع کیاہے، دارالعرب الاسلامی سے جس کی اشاعت ہوچکی ہے۔

یہ تھا ایک مختصر سا جائزہ اسلامی سرمایہ کی تحقیق واشاعت میں ہندوستانی علماء کی خدمات کا، لیکن افسوس اب یہ ملک ان جیسے مایہ ناز محققین سے محروم ہوچکا ہے، البتہ جامعات اور بحث وتحقیق کے مراکز سے قوی امید ہے کہ طالبان علوم نبوت اوراسکالرس میں مخطوطات کی تحقیق واشاعت، بکھرے موتیوں کی ترتیب، ان کے تعارف وتبصرہ، اہم مواد کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کا ذوق پیدا کریں، اوران نوجوان کے لیے اسکالرشپ کا انتظام کریں جو ہندوستانی علماء کی عربی تصنیفات کی تحقیق وجستجو، اورعربی کے علاوہ دیگرزبانوں میں لکھی گئی کتابوں کوعربی میں منتقل کرنے کا کام کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کواپنے دین، اورروراثت کی حفاظت اورخدمت کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین!

مولانا مقبول احمد فلاحی مرحوم

مولانا انعام اللہ فلاحی

غالباً ۱۹۸۳ء کا سال تھا۔ جامعۃ الفلاح میں میرا عالمیت کا آخری سال۔ فلاح کے مین گیٹ پر ایک رکشہ پر لاؤڈ اسپیکر لگا تھا۔ ایک شخص جس کے چہرے پر عالمانہ شان جھلک رہی تھی، وجاہت کا رعب تھا، آواز گرج دار تھی، اونچی ٹوپی اور کرتا پاجامہ زیب تن کیے ہوئے، ہاتھ میں مائک تھا، رکشے کے ساتھ بلند آواز سے کہنا شروع کیا: 'بسم اللہ مجرھا و مرساھا۔ آؤ ہم صفائی اور ستھرائی کا عزم کریں۔ گھر کی، محلے کی، اپنے سماج اور ماحول کی، اپنے ذہن وفکر کی اور اپنے اردگرد کے ماحول کی۔'' یہ تھے ناظم علاقہ گورکھپور مولانا مقبول احمد فلاحی۔ رکشے کی دوسری طرف مولانا عبدالسلام فلاحی بیٹھے ہوئے تھے۔ رکشہ آگے بڑھا۔ اس قافلے کی قیادت جناب سید حامد حسین مرحوم، امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند اتر پردیش اور امیر مقامی حکیم محمد ایوب مرحوم کر رہے تھے۔ ساتھ میں مقامی ارکان وکارکنان صفائی کے سامان: پھاوڑا، بیلچہ، چونا اور بلیچنگ پاؤڈر لیے ہوئے محلے کی صفائی مہم پر نکلے تھے۔ دراصل یہ پروگرام جماعت اسلامی حلقہ اتر پردیش کے 'سماج سُدھار کیمپ' کا حصہ تھا۔ جماعت نے پورے صوبے سے منتخب بستیوں کو نشانہ بنا کر ان میں کام کو فروغ دینے اور انھیں مثالی بستیاں بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان بستیوں میں بلریا گنج کا قصبہ بھی شامل تھا۔ سماج سدھار کیمپ، اس منصوبے کو حاصل کرنے کی ایک سرگرمی تھی۔ یہ کیمپ بہت دل چسپ اور اہمیت کے حامل ہوتے تھے۔ تین (۳) سے (۷) دنوں تک منعقد کیا جاتا تھا۔ چوبیس (۲۴) گھنٹے کا نظام الاوقات بن جاتا تھا، جس میں ذاتی تربیت، دعوت واصلاح اور سماجی ومعاشرتی مسائل کے حل کی کوششیں ہوتی تھیں۔ اجتماعی طور پر تہجد کی نماز ادا کی جاتی تھی اور تمام ارکان وکارکنان فجر کی نماز الگ الگ محلوں کی مسجد میں جا کر ادا کرتے۔ نماز کے بعد درسِ قرآن کے پروگرام ہوتے۔ پھر کیمپ میں واپس آکر آگے کے پروگرام کی تیاری کرتے۔

اس کیمپ کی اہمیت کا اندازا اس کے شعبوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ شعبۂ دعوت واصلاح، طب وصحت،

عدل وانصاف، زراعت، تعلیم وتدریس، اخوت ومساوات، صفائی ستھرائی وغیرہ۔صفائی ستھرائی کے ضمن میں یہ قافلہ چل رہا تھا، مولانا مقبول احمد فلاحی علاقۂ گورکھپور کے ناظم تھے، اس لیے وہ کیمپ کے آرگنائزر بھی تھے۔

جامعۃ الفلاح نے اپنے اغراض ومقاصد میں جس طرح کے افراد تیار کرنے کا عزم کیا ہے، وہ اس طرح ہے:

۱۔ جو قرآن وسنت کا گہرا علم اور دینی بصیرت رکھتے ہوں۔

۲۔جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر ہو اور غیر اسلامی افکار ونظریات سے بخوبی واقف ہوں۔

۳۔جو اسلامی اخلاق وکردار کے حامل ہوں۔

۴۔جن میں احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ ہو۔

۵۔ جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو اور وسعت قلب ونظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔

جامعہ کے ان مقاصد کا عکس جن ہونہار فلاحیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے، اس فہرست میں ایک ابھرا ہوا نام مولانا مقبول احمد فلاحی مرحوم کا بھی ہے۔مولانا کا تعلق ایک زمین دار گھرانے سے تھا۔گھر اور خاندان کے لوگ ممبئی میں کاروبار کر رہے ہیں۔ جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد ان کے لیے بھی موقع تھا کہ کاروبار کی دنیا میں جاکر طبع آزمائی کریں، لیکن انھوں نے اپنے لیے دعوت وتربیت کا میدان منتخب کیا۔

مولانا مقبول احمد فلاحی تحریک اسلامی ہند سے وابستہ ہونے کے بعد مختلف ذمہ داریوں پر فائز رہے۔ ابتدا میں ضلع بدایوں کے قصبہ ککرالہ میں رہے، اس کے بعد چار (۴) سال بریلی علاقہ کے ناظم رہے۔گورکھپور علاقہ کی نظامت تین میقاتوں (۱۲؍سال) تک کرتے رہے اور جامعۃ الفاح، بلریا گنج میں تقریباً آٹھ (۸) سال تک مختلف حیثیتوں سے اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ کچھ دنوں ادارہ علمیہ اور شعبۂ رابطہ سے وابستہ رہے۔ نائب مہتمم کی حیثیت سے کام کیا اور نائب ناظم کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دیتے رہے۔ جامعۃ الفلاح کی مجلس منتظمہ کے کافی عرصے رکن رہے۔لکھنؤ میں جماعت کے کاموں میں تقریباً دس برسوں تک مصروف رہے۔ جماعت اسلامی ہند کی مجلس نمائندگان اور حلقۂ اتر پردیش کی مجلس شوریٰ کے مسلسل کئی میقاتوں تک رکن رہے۔

جامعۃ الفاح میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے مختلف شعبوں کے لیے رہ نما خطوط تیار کیے۔ ادارۂ علمیہ کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ جامعۃ الفلاح کو خود کفیل بنانے کے لیے کئی پروجکٹس پر کام کیا۔اللہ تعالیٰ

نے مولانا کو بہت خوبیوں کا مالک بنایا تھا۔انھیں پلاننگ اور منصوبہ بندی کا فن آتا تھا۔خود منصوبہ سازی کرتے اور اسے کمپوز کر لیتے تھے۔ای میل وغیرہ بھی خود ہی کرتے تھے۔جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے ہمہ وقت فکر مند رہتے تھے۔

علمی کام

مولانا مقبول احمد فلاحی تقریر اور تحریر دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔جب وہ ناظم علاقہ تھے،ان کے خطابات کی شہرت تھی۔جامعہ میں بھی خطبۂ جمعہ ہو یا طلبہ سے خطاب،جب بھی ان سے کہا جاتا بلا تکلف تیار ہو جاتے تھے۔

ماہ نامہ حیاتِ نو میں انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔'دعوت' کے موضوع سے انھیں خصوصی دل چسپی تھی۔اس وجہ سے ان کے زیادہ تر مضامین اسی موضوع سے متعلق ہیں۔حیات نو میں ان کے شائع ہونے والے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔سماج سدھار کیمپ (۸۵۔۱۹۸۶ء)

۲۔داستان شفقت وعاطفت (دسمبر وجنوری ۱۹۸۶ء)

۳۔مسلم پرسنل لا۔ماضی،حال اور مستقبل (مارچ ۱۹۸۶ء)

۴۔ملک کی موجودہ صورتِ حال اور امت کی ذمہ داریاں (مئی ۱۹۸۶ء)

۵۔فریضۂ اقامت دین اور معاشی مصروفیات (جون ۱۹۸۶ء)

۶۔انتشار ملت کے اسباب اور ان کا تدارک (اگست ۱۹۸۶ء)

۷۔ملک کی موجودہ صورتِ حال اور ہماری ذمہ داریاں (مارچ۔اپریل ۱۹۸۸ء)

۸۔انبیائی اسلوبِ دعوت (جولائی ۲۰۰۱ء)

۹۔جامعۃ الفلاح کے قیام کے اسباب ومحرکات (اکتوبر ۲۰۰۱ء)

۱۰۔قیادت کے اوصاف (دسمبر ۲۰۰۱ء)

۱۱۔دعوتِ دین۔ایک جائزہ (دسمبر ۲۰۰۳ء)

۱۲۔اسلامی تصور تعلیم اور جامعۃ الفلاح (ستمبر ۲۰۱۰ء)

۱۳۔دعوت دین کی عصری معنویت (دسمبر ۲۰۱۰ء)

۱۴۔قرآن کے اسالیبِ دعوت (مارچ ۲۰۱۱ء تا مارچ ۲۰۱۳ء تک [آٹھ قسطوں میں])

۱۵۔ امت کے داعیانہ کردار کی بازیافت۔ کیوں اور کیسے؟ (دسمبر ۲۰۱۳ء)

بہتر ہوگا کہ ان کی تحریروں پر مشتمل حیاتِ نو کا ایک خاص نمبر شائع کیا جائے یا ادارہ علمیہ سے ان کے مضامین کے مجموعہ کو ایڈٹ کر کے طبع کیا جائے۔

مولانا کے شخصی احوال درج ذیل ہیں:

وطن/گاؤں:	بلسہا، ضلع سدھارتھ نگر، یوپی
نام:	مقبول احمد
تاریخ پیدائش:	یکم جولائی ۱۹۵۶ء
ابتدائی تعلیم:	گاؤں کے مدرسے حاصل کی
اعلیٰ تعلیم:	جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ [عالمیت: ۱۹۷۵ء، فضیلت: ۱۹۷۷ء]
والد:	محمد امین
والدہ:	نجم النساء
اہلیہ:	شمع بانو
بھائی:	(۱) برکت اللہ، (۲) جمیل احمد مرحوم، (۳) اقبال احمد فلاحی
بہنیں:	(۱) اسماء خاتون (۲) قاسما خاتون
بیٹے:	(۱) احمد محمود فلاحی (۲) انجینئر احمد مودودی فلاحی
بیٹیاں:	(۱) زرینہ شمع، (۲) حمیرا شمع، (۳) مریم شمع، (۴) حسینہ شمع
تاریخ وفات:	۲۰/اپریل ۲۰۲۱ء

مزاج و شخصیت

بعض لوگ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ نظر آتے ہیں۔ مولانا کی خوبی یہ تھی ان کی زندگی لوگوں کے سامنے بالکل کھلی کتاب تھی۔ جو سمجھ میں آتا تھا، اس کا اظہار بلا تکلف کر دیتے تھے۔ وہ بات کس کے خلاف ہوگی؟ کس کے موافق ہوگی؟ اس کی پروا نہیں کرتے تھے اور نہ دل میں کسی سے متعلق کوئی غبار رکھتے تھے۔ صاف دل کے مالک تھے۔ ان کے اظہار خیال کی بے باکی اور حاضر جوابی سے جن لوگوں کے مفادات پر ضرب پڑتی تھی وہ ناخوش رہتے تھے اور پیٹھ پیچھے ان کی مخالفت کرتے تھے۔

بے عیب ذات تو صرف اللہ کی ہے اور معصوم تو صرف انبیاء کی زندگیاں ہوتی ہیں۔ مولانا کو جرأت اور حوصلے کا وافر حصہ ملا تھا، اس کی وجہ سے کئی بار معاملات پیچیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کہیں کہیں مشاورت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا، جن کے نتیجے میں وہ مسائل سے بھی دوچار ہو جاتے تھے۔

واپسی

دنیا میں جو بھی آیا ہے، اسے ایک دن یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ کسی شخص کو نہیں معلوم کہ کب اور کہاں اس کے رب کی طرف سے بلاوا آجائے گا؟ مقبول صاحب جس سادگی سے اچانک رخصت ہوئے وہ قابلِ رشک ہے۔ لکھنؤ سے اپنے گاؤں گئے تھے کہ چند دنوں میں واپس آجائیں گے، لیکن لکھنؤ واپس آنے کے بجائے اپنے رب کی طرف واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

مولانا نے طالب علمی کی زندگی کے بعد سے جس میدان کو منتخب کیا تھا، پوری زندگی اسی راہ کے راہی رہے۔ زندگی کے آخری لمحے تک دعوتِ دین ان کا مشن اور مقصد رہا۔ اسی کے لیے کام کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، کم زوریوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

ثانوی درس گاہ، رام پور کے ایک سابق طالب علم

حبیب حامد عبدالرحمٰن الکاف سے تحریری انٹرویو

رضوان احمد فلاحی

....

(جناب حبیب حامد عبدالرحمٰن الکاف، ثانوی درس گاہ رامپور (۱۹۵۰-۱۹۶۰) کے طالب علم رہے ہیں۔ان کا ابھی حال میں ۲۴/ جولائی ۲۰۲۱ء کو یمن میں انتقال ہوا ہے۔مرحوم درس گاہ کے ان گریجویٹس میں سے تھے جنھوں نے قلم کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ثانوی درس گاہ کے بارے میں مرحوم کے احساسات و تاثرات جاننے کے لیے راقم الحروف نے ۲۰۱۳ء کے وسط میں انہیں ایک طویل سوال نامہ ترتیب دے کر بھیجا جس کا انہوں نے تفصیل سے جواب دیا اور جسے ذیل میں دیا جا رہا ہے۔ راقم کا اسی سلسلے کا ایک مضمون ’’ڈاکٹر قاضی اشفاق احمد صاحب سے ایک ملاقات‘‘، ماہنامہ زندگیٔ نو، نئ دہلی، کی اشاعت برائے جولائی ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا ہے۔واضح رہے ڈاکٹر قاضی اشفاق صاحب بھی ثانوی درس گاہ کے سابق طالب علم ہیں اور سڈنی (اسٹریلیا) میں مقیم ہیں۔الکاف صاحب نے اپنے جواب میں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔)

(۱)

نام: حبیب حامد عبدالرحمٰن الکاف اصلاحی (حبیب حضرموت میں سید کو کہتے ہیں۔ چوں کہ ہندوستان میں لوگ اس کو نہیں جانتے ہیں، اس لیے میں حبیب کی بجائے سید لکھتا ہوں۔

موجودہ مصروفیت:

۷۸ سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں۔اس لیے کوئی کام پیسہ کمانے کی خاطر نہیں کرتا ہوں۔اب صرف:

(الف) قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر بزبان اردو کر رہا ہوں۔آج المائدہ کی آیات ۲۷-۳۴ کا ترجمہ

کر چکا ہوں۔کل اس پر نظر ثانی کر کے اس کی تفسیر لکھوں گا۔اس تفسیر کی خصوصیات یہ ہیں:

(ا)اس میں آیات کریمات کی موجودہ صورت حال پر تطبیق کی ایک حقیر مگر جرأت مندانہ کوشش ہے۔ اس کے ذریعہ ثابت یہ کرنا ہے کہ قرآن کریم کتاب ہدایت ہے،صرف اصولی باتوں اور ہدایات کا مجموعہ نہیں ہے۔دوسری طرف سے اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد لکھنے والا اور آنے والا اپنے زمانے کی نئی نئی مثالیں پیش کر کے قرآن کو ایک کتاب ہدایت ثابت کرے گا۔آپ اس حقیقت کو میری تفسیر میں اور ترجمہ میں قدم قدم پر پائیں گے۔ میں دن اور تاریخ کے ساتھ حوالہ دے کر یہ بتاتا ہوں کہ آج کے دن فلاں آیت ہمیں کون سی روشنی مہیا کرتی ہے۔

(۲)اس تفسیر کی دوسری خصوصیت نظم قرآن کو ملحوظ رکھنا ہے۔

(۳)اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ مولانا حمید الدین فراہی،مولانا مودودی اور سید قطب شہید اور خاکسار حبیب حامد الکاف کے افکار کا نچوڑ ہے۔

(ب) روزانہ کچھ وقت میں فضیلۃ الدکتور الشیخ یوسف القرضاوی کی معرکۃ الآراء تصنیف 'فقہ الزکاۃ' کے چند ابواب کا ترجمہ مع اپنی طرف سے اضافات کے ساتھ کرتا ہوں۔اس ترجمہ اور ان اضافات کا اصل ہدف قارئین کرام میں علمی کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کا ذوق پیدا کرنا ہے یہاں تک کہ وہ ماضی کو حال سے، قیاس اور اجتہاد کے ذریعہ جوڑنے کے طریقے سیکھ سکیں اور سوچ سکیں جیسا کہ القرضاوی صاحب نے ''مناقشہ اور ترجیح'' کے عنوان سے پیش کیا ہے اور بعض مقامات پر سب ہی اختلاف رائے کو رد کر کے اپنا اجتہاد پیش کیا ہے اور دلیل بھی خوب زور دار دی ہے۔ان کی جرأت فکر و تحریر کو اس ترجمہ کے ذریعہ عام کرنا چاہتا ہوں۔یوں بھی حیدرآباد قیام کے دوران میں نے: (ا) امام الشوکانی کی کتاب اجتہاد ''السیل الجرار المتد فق علی حدائق الأزہار''، (۲) ڈاکٹر زیدان کی کتاب ''اصول الفقہ'' اور ''مقدمہ ابن خلدون'' اور ''فی ظلال القرآن'' (عربی) کے بعض اجزاء اجتہادی فکر پیدا کرنے کے لیے کبھی اردو میں اور کبھی عربی میں درساً درساً پڑھائے ہیں۔گویا اصل مقصد اجتہادی فکر پیدا کرنا اور اس کا نشو ونما کرتا ہے۔

(ج)اس کی عملی تطبیق آج مصر اور عالم اسلام کے حالات پر لمبے لمبے تجزیاتی مقالات لکھ کر لاہور روانہ کرنا ہے تا کہ لوگ عملی دنیا سے نمٹنے کے ڈھنگ سیکھ سکیں۔ان کا مقصد اسٹراٹیجک تفکیر و تجزیے کو عام کرنا ہے۔

مکمل پتہ: شارع الرباط، خلف محطۃ البنزین، بیت الکاف، صنعاء، الیمن PO Box: 13320, Maeen Post Office, San'a, Yemen، فون نمبر:464029 1 967+، موبائل نمبر: 736 259469، ای میل:alkaff786@gmail.com

(۲)

ا- آپ کب سے کب تک درس گاہ کے طالب علم رہے؟

اب تو تاریخیں یاد نہیں۔ خیال آتا ہے کہ اپریل/مئی ۱۹۵۸ سے جولائی ۱۹۶۰ تک یعنی تقریباً دو سال میں درس گاہ میں رہا۔

۲- درس گاہ سے طالب علمانہ وابستگی کا محرک کیا تھا؟

درس گاہ سے وابستگی کا محرک یہ تھا کہ میں اسلامی اقتصاد کی علمی خدمت انجام دے سکوں۔ مولانا محمد یوسف صاحب، اس وقت کے قیم جماعت نے مجھ سے یہی سوال کیا تھا اور اس پر اظہار خیال کے لیے کہا تھا، میں نے یہی جواب ان کو لکھ کر دیا تھا۔

۳- آپ کے زمانۂ طالب علمی میں درس گاہ کا انتظامی ڈھانچہ کیا تھا، ناظم اور پرنسپل کی ذمہ داریاں کن حضرات کے سپرد تھیں؟

ہمارے زمانہ طالب علمی میں مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب صدر مدرس/ ناظم تھے۔ کوئی پرنسپل نہیں پایا جاتا تھا۔

۴- کیا آپ نے چار سالہ نصاب کی تکمیل کی؟

میں نے چار سالہ نصاب کی تکمیل نہیں کی، بلکہ دو سال پڑھ سکا تھا کہ درس گاہ بند کر دینے کا فیصلہ ہو گیا۔

۵- کیا تکمیل پر کوئی سند دی جاتی تھی؟ اگر ہاں تو کیا اس کی فوٹو کاپی مہیا ہو سکتی ہے؟

ہاں تکمیل پر سند دی جاتی تھی۔ مجھے بھی مولانا صدرالدین اصلاحی نے دو سال کی سند اپنی دستخط سے عنایت فرمائی تھی۔ حال حال تک وہ میرے کاغذات میں تھی۔ مگر اب کہاں ہے مجھے معلوم نہیں۔ اس کا بہت بہت افسوس ہے۔

(۳)

ا- درس گاہ کا نصابِ تعلیم:

درس گاہ کا نصاب تعلیم سوائے عربی زبان وادب کے معیاری اور محنت طلب تھا۔ کیونکہ عربی زبان وادب میں قابل لحاظ مہارت حاصل کرنے کے بعد ہمیں قرآن مجید، سنت نبویہ شریفہ اور فقہ اسلامی میں اونچے علمی کام انجام دینا تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر نصاب تعلیم کا معیاری اور محنت طلب ہونا ناگزیر تھا۔

۲- طریقۂ تدریس محاضراتی تھا یا مبنی بر تدریس متن، یا دونوں؟ کیا طلبہ کو مطالعہ دیکھ کر کلاس میں آنے کی ہدایت تھی اور اس کی سختی سے پابندی کرائی جاتی تھی؟

طریقۂ تدریس مبنی بر تدریس متن تھا۔ طلبہ کو درس کی تیاری کر کے آنے کی ہدایت تھی جس پر سارے ہی طلبہ سختی سے پابند تھے۔

۳- تعلیم کے اوقات کیا تھے؟

تعلیم آٹھ بجے سے بارہ بجے ظہر تک ہوتی تھی۔

۴- زیر تدریس مضامین کیا تھے؟

زیر تدریس مضامین یہ تھے: (۱) عربی زبان وادب (۲) قرآن کریم تحقیقی مطالعہ کے ساتھ (۳) ترمذی شریف (۴) فقہ میں القدوری (۵) مقدمہ ابن خلدون (بہت ہی ابتدائی حصہ) اور بدایۃ المجتہد کے چند ابواب۔

خارج از نصاب ثانوی درس گاہ میں مجھے ام اے (اکنامکس) پڑھنا تھا۔ اس میں میرے گائیڈ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی صاحبان تھے۔ دو بار میں چند دنوں کے لیے علی گڑھ گیا اور حسب توفیق ام اے کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ یہ تشفی بخش انتظام نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے بھرپور استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ڈاکٹر خسرو کی نگرانی میں بہت سی غیر درسی کتابیں پڑھ چکا تھا۔ ان کی اور میرے انٹرمیڈیٹ کے جاگیردار کمیونسٹ لکچرر پروفیسر عبدالغفار صاحب کی کتابوں نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ثانوی درس گاہ نصاب کے اعتبار سے عدم توازن کا شکار تھی۔ یہاں ساری ترکیز دینی علوم پر تھی۔ عصری علوم پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے اقتصاد اسلامی میں جو کچھ بھی کام کیا ہے وہ میری اپنی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہے، خواہ اس کام کا دینی پہلو ہو یا عصری علوم کا پہلو ہو۔ آپ میرے کتابچوں کے مطالعہ سے اس حقیقت پر پہنچ سکتے ہیں۔

۵- غیر نصابی سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں؟

غیر درسی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ نہ تو تحریری مقابلے عربی/ اردو/ انگلش میں ہوا کرتے تھے نہ تقریری مقابلے۔ مقالے لکھوانے کی طرف قطعی توجہ نہیں دی گئی۔ انگریزی اخبارات سے مضامین کا ترجمہ کر کے میں ''سہ روزہ دعوت'' میں شائع کیا کرتا تھا۔ اس سے مجھے ترجمہ کرنے اور مقالے لکھوانے کی تربیت ہوگئی۔ علاوہ ازیں کھیل کود یا پکنک وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ہم لوگ والی بال مرکز کے حضرات کے ساتھ یا کبڈی کھیل لیا کرتے تھے۔

٦- غیر تدریسی اوقات میں طلبہ کی بالعموم مصروفیات کیا ہوتی تھیں؟

خالی۔

(۴)

١- اپنے اساتذہ کرام کے نام اوران کے ذمہ تدریسی مضامین کی نشاندہی کیجیے؟

مولانا جلیل احسن ندوی عربی زبان وادب اور تفسیر کے (پہلے سال) میں استاد تھے، جب کہ ترمذی شریف مولانا سید احمد عروج قادری کے ذمہ تھی۔ کبھی کبھی مولانا حامد علی صاحب القدوری بھی پڑھایا کرتے تھے جو اصلاً عروج صاحب کے حوالہ تھی۔ دوسرے سال میں تفسیر کی تدریس اصلاً مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کے ذمہ تھی۔ وہ جب چھٹی پر اعظم گڑھ گئے تو تقریباً ایک ماہ تک امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی نے قرآن کریم ہمیں پڑھایا۔ مقدمہ ابن خلدون کا اتنا تھوڑا درس ہوا کہ مدرس صاحب کا نام تک یاد نہیں۔

سوائے مولانا جلیل احسن صاحب کے باقی اساتذہ کرام ہمہ وقتی نہیں بلکہ جز وقتی تھے۔ اس لیے غیر تدریسی اوقات میں ان سے استفادے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ مولانا جلیل احسن صاحب سے کبھی کبھی استفادہ کیا کیونکہ وہ ہم طلبہ کے ساتھ دارالاقامت میں مقیم تھے۔ اس کو بھی آپ ایک بڑا عیب تصور کر سکتے ہیں۔

٢- اساتذہ کس حد تک طلبہ کو مطمئن کرنے پر قادر تھے؟

چوں کہ ہم سب گراجوایشن کے بعد آئے تھے اس لیے تشفی بھر جواب کے خواہش مند نہیں تھے، بلکہ ہم سب کے اپنے اپنے سوالات بھی تھے اور جوابات بھی۔ یوں ہم سب اساتذہ کرام کے جوابات کے بہت ہی کم محتاج تھے کیونکہ بحث کے وقت ہم اور ہمارے اساتذہ کرام بالکل دوستانہ ماحول میں بے تکلفی کے ساتھ بحث میں حصہ لیا کرتے تھے۔

٣- آپ کن اساتذہ سے زیادہ متاثر ہوئے اور کیوں؟

میں کیا ہم سب طلبہ کسی استاذ محترم سے متاثر نہیں ہوئے۔ مگران کے علم کا اور بزرگی کا ہمیں پورا احساس تھا۔ اس لیے ان سے بڑی عزت کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی کبھی کسی استاد محترم سے ٹکرایا ہو یا بات رنجش تک پہنچی ہو۔ اس میں ہمارے یونیورسٹی پس منظر کو بڑا دخل تھا۔

۴- اساتذہ اور دیگر ذمہ داروں کا رویہ طلبہ سے کیسا تھا؟

ہمارے اساتذہ کرام اور دیگر ذمہ داران جماعت کا ہمارے ساتھ انتہائی مشفقانہ رویہ تھا۔ مجھے کوئی تلخی کا واقعہ یاد نہیں۔

۵- تدریس کے دوران آزادانہ سوال جواب اور مباحثوں کی اجازت کس حد تک تھی؟

تدریس کے دوران بحث ومباحثہ کی کوئی حد نہیں تھی۔ بعض وقت تفسیر میں دو دو دن ایک ہی آیت کے سلسلے میں نکل جاتے تھے کیونکہ ہم سب تیاری کر کے اپنی اپنی رائے کے ساتھ آیا کرتے تھے اور کھل کر گفتگو ہوا کرتی تھی۔

۶- اگر کبھی کوئی استاد فوری طور پر کسی سوال کا جواب نہ دے سکا ہو تو ایسی صورت میں استاد کا رویہ کیا ہوتا تھا؟ نرمی سے آئندہ جواب دینے کا وعدہ یا برعکس؟ کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی سوال کو استخفاف کا سامنا کرنا پڑا ہو؟

مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں ہے کہ کبھی استاذ کریم نے کل کی بات کی ہو۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی استاد محترم نے بڑی ہوشیاری سے دوسرے دن اپنا جواب کچھ اس طرح پیش کیا ہو کہ ہمیں احساس ہی نہ ہوا ہو کہ یہ کل کے سوال کا جواب ہے۔ بالفاظ دیگر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انتہائی عالمانہ اور دوستانہ ماحول کی وجہ سے اور ہم طلبہ کی علمی جستجو کی بنا پر دوران تدریس کوئی ناخوش گوار بات کبھی بھی نہیں پیش آئی۔

۷- غیر تدریسی اوقات میں اساتذہ سے کس حد تک استفادے کی گنجائش تھی؟

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ سوائے مولانا جلیل احسن صاحب کے کسی سے بھی غیر تدریسی اوقات میں استفادہ کا موقع نہیں ملا۔

(۵)

۱- آپ کے رفقاء درس کے نام کیا ہیں؟

میرے ساتھیوں کے نام یہ ہیں: (۱) ڈاکٹر عبدالباری (شبنم سبحانی) صاحب، (۲) جناب عبدالرشید عثمانی صاحب، (۳) جناب عاطف شاہ جہاں پوری صاحب، (۴) جناب محمد اصلح باروی صاحب اور (۵) جناب محمود لکھنوی مرحوم تھے۔ ہمارے تفسیر کے درس میں مولانا جلال الدین عمری صاحب، حال امیر جماعت اسلامی ہند اور مولانا وحیدالدین خان صاحب بھی شریک ہوا کرتے تھے۔

۲- آپ کے زمانہ میں طلبہ کی مجموعی تعداد کیا تھی؟ براہ کرم ان کے نام درجہ بندی کے ساتھ ذکر کیجیے؟

مجھے فی الحال صرف جناب اکرم باروی صاحب کا نام یاد آرہا ہے جو جناب اصلح باروی صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ اس طرح طلبہ کی کل تعداد چھ ہو جاتی ہے۔

(۶)

۱- درس گاہ سے وابستگی پر اہل خاندان کا ردعمل موافقانہ تھا یا مخالفانہ؟ اگر مخالفانہ تو کیا وجہ تھی اور اس سے آپ کس طرح نبرد آزما ہو سکے؟

میرے اہل خاندان الحمدللہ موافق تھے۔

۲- اخراجات کا انتظام طلبہ کے ذمہ تھا یا ادارے کے؟

درس گاہ ہمیں ہر ماہ ۳۰ روپیے جیب خرچ دیتی تھی جس سے ہمارے سارے اخراجات پورے ہو جایا کرتے تھے الحمدللہ۔

(۷)

۱- درس گاہ کے اغراض و مقاصد کے پیش نظر، نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس سے آپ مطمئن تھے یا ان میں مزید بہتری کی گنجائش تھی؟

میرا جہاں تک تعلق ہے میں جانتا تھا کہ اس وقت جماعت کی مالی حالت مادی اعتبار سے اس سے زیادہ اخراجات کی متحمل نہیں تھی۔ یہ احساس اس علم و ادراک کے ساتھ تھا کہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس میں بہتری کی بہت کچھ گنجائش تھی مگر اس کے لیے مالیہ کی ضرورت تھی جو مفقود تھا۔

۲- کیا گنجائش کی طرف ذمہ داروں کو متوجہ کیا جاتا رہا؟ اگر ہاں تو ان کا ردعمل کیا رہا؟

ہم لوگوں نے کبھی ذمہ داروں کی توجہ بہتری کی طرف مبذول نہیں کرائی کہ اس کا جواب ہم کو معلوم ہی تھا جس کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے۔

(۸)

۱- جن توقعات کی بنا پر آپ درس گاہ سے وابستہ ہوئے، وہ کس حد تک پوری ہوئیں؟

الحمدللہ میں کبھی بھی مایوس نہیں ہوا۔ چوں کہ درس گاہ بند ہو چکی تھی اس لیے ان توقعات کو ایک فرد کی حیثیت سے جامہ پہنانا تھا۔ ورنہ یہ متوقع تھا کہ فارغین کے لیے ان کی صلاحیتوں، رجحانات اور تجربات کے لحاظ سے جماعت ان سے مستفید ہوتی۔ اس میدان میں جماعت کوئی مثبت اور قابل عمل پروگرام مال کی قلت بلکہ اس زمانے میں بہت قلت کی وجہ سے نہیں بنا سکی جس کی وجہ سے درس گاہ کے فارغین نہ تو فرداً فرداً اور نہ اجتماعیاً کوئی قابل ذکر خدمت انجام دے سکے۔ جو کچھ بھی کامیابی حاصل ہوئیں افراد کی تھیں جیسا کہ ڈاکٹر

نجات اللہ صدیقی صاحب کا فیصل ایوارڈ حاصل کرنا، جدہ میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کے زیرنگرانی اسلامی اقتصاد پرایک عالمی سیمنار منعقد کرانا یا پاکستان میں اسلامی اقتصادیات اور بینکنگ میں حصہ لینا وغیرہ وغیرہ۔

اگر مابعد التخرج کوئی پروگرام ہوتا اور ان قوتوں اور صلاحیتوں کو منظّم طور پر کام پر لگادیا جاتا تو اس کے نتائج نہ صرف جماعت کے لیے بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی بہت خوش گوار ہوتے۔آج بھی اس جانب کوئی خاص توجہ نظر نہیں آتی۔

۲- کیا کبھی آپ کو درس گاہ سے وابستگی کے فیصلہ پر نظر ثانی کا خیال آیا؟ اگر ہاں تو کس سبب سے؟

الحمد للہ مجھے کبھی بھی وابستگیٔ درس گاہ کے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت پیش نہیں آئی، بلکہ میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا آیا ہوں کہ جب بھی مجھے لندن، نیویارک، شکاگو، جنیوا، فرانکفورٹ وغیرہ میں سعودی عربین ایرلائن میں مغربی دنیا کے بڑے بڑے بینکوں جیسا کہ سٹی کورپ، امریکن ایکسپریس، ڈائنرز، ماسٹر کارڈ اور ویزا کارڈ، اور جنیوا میں IATA کے سینیر ذمہ داروں سے ملنے اور کروڑوں اور اربوں ڈالر کے کاروبار کے سلسلے میں بات چیت کرنے اور معاملات کے سلسلے میں مالی اور قانونی امور پر بحث ومباحثہ کرنے کا موقع ملتا تو مجھے احساس ہوتا تھا کہ اللہ کے فضل سے ثانوی درس گاہ نے مجھ میں خوداعتمادی، بلند نظری، بلند ہمتی اور گہری قانونی نظر بین الاقوامی معاہدات- مالی معاہدات جن کے بین الاقوامی قانونی پہلو ہوتے ہیں- پیدا کی وہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی۔بعض وقت بلکہ اکثر اوقات میں اکیلا یوروپ/امریکا میں ہوتا جب کہ میرے سامنے دو دو تین تین جہاں دیدہ تجربہ کار ادھر کے لوگ ہوتے اور بات چیت ہوتی۔تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ وہ حیران ہوتے اور کہہ بیٹھتے کہ ہم نے تم جیسا بات چیت کرنے والا negotiator بہت کم دیکھا ہے جس کا تعلق مشرق سے ہو کیونکہ میں الحمد للہ کبھی بھی ان کے رعب میں نہیں آیا۔ ہمیشہ برابری کی سطح پر بات چیت کی ان کی اپنی زبان میں، لہجے میں اور انداز میں۔اسی وجہ سے سعودی ایرلائن مجھے بعض وقت تنہا بڑے بڑے اجتماعات میں اپنی نمائندگی کے لیے روانہ کرتی تھی۔

(۹)

ا۔ جولائی 1960 میں درس گاہ مستقلاً بند کردیے جانے کے فیصلے پر آپ کے احساسات کیا تھے؟

مجھے کوئی خاص دھکا نہیں لگا، کیوں کہ مدرسۃ الاصلاح میں تکمیل نصاب کا انتظام ہوگیا، جس سے مجھے ’اصلاحی‘ بننے کا شرف بھی حاصل ہوگیا۔

۲۔آپ کے خیال میں بندش کے امکانی اسباب کیا تھے:

الف مالی وسائل کی قلت

ب طلبہ کا نہ ملنا

ج مناسب تدریسی عملہ کی عدم دستیابی

د متوقع عمومی تعاون کا نا ملنا

ھ درس گاہ اور اقامت گاہ کا علاحدہ نظم نہ ہونا

و اندرونی سطح پر شخصیات کا ٹکراو یا معاصرانہ چشمک

ز یہ رائے کہ تحریکوں کو تدریسی ادارے نہیں قائم کرنے چاہییں

ح یہ احساس کہ درس گاہ بعد کے نئے نوجوانوں کی امنگوں اور حوصلوں کا میدان نہ بن سکی

ط کوئی اور سبب؟

نوٹ: اگر جواب (د)، (و)، (ز) یا (ح) ہو تو براہ کرم قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

بندش درس گاہ کے متعدد اسباب تھے جن میں قلت مال، قلت اساتذہ، قلت طلبہ اور قلت ادراک، اہمیت درس گاہ سب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جن امکانی اسباب کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کا مجھے علم نہیں ہے۔

(۱۰)

ا۔کیا آپ نے ثانوی درس گاہ میں داخلہ لینے سے قبل یا بعد از فراغت مدرسۃ الاصلاح سے بھی استفادہ کیا؟ بعد از فراغت مدرسۃ الاصلاح سے وابستگی فیصلہ ذاتی تھا یا ثانوی درس گاہ کے منتظمین کا؟

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، مدرسۃ الاصلاح میں تکمیل نصاب کا فیصلہ اور انتظام خود جماعت نے کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ بڑا مبارک فیصلہ تھا۔ اس کے ذریعہ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ مدرسہ سے فارغ ہونے کی دوسری سعادت حاصل ہوئی جس نے خود اعتمادی پیدا کرنے میں زبردست رول ادا کیا۔ اس کے بعد میں یونیورسٹی کے حلقوں میں اجنبیت نہیں محسوس کرتا تھا اور نہ علماء کے ہی درمیان مجھے وحشت ہوتی۔ یہ آج بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی عظیم نعمت ہے۔ الحمد للہ۔

۲۔مدرسہ الاصلاح پر آپ کا قیام کتنے عرصہ رہا اور کن اساتذہ سے کن مضامین میں استفادہ کیا؟

میرا، ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب کا اور مرحوم محمود لکھنوی صاحب کا قیام مدرسۃ الاصلاح میں تقریباً

ڈیڑھ سال رہا۔ ہماری تدریس کا الگ سے انتظام کیا گیا تھا شاید اس لیے کہ ہم آخری درجوں کے طلبہ کی عمروں سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ تفسیر ہم نے مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب سے، حدیث اور فقہ مولانا شبیر احمد صاحب سے پڑھی۔ بہرحال خوب اچھی گزری۔ ہمارے رہنے سہنے کا بھی انتظام الگ ہی تھا۔ ہم اطراف واکناف میں گھومے پھرے۔

۳۔ مدرسۃ الاصلاح اور ثانوی درس گاہ کے نصاب وطریقۂ تدریس میں آپ نے کیا فرق محسوس کیا؟ کس کو آپ بہتر تصور کرتے ہیں؟

اپنے اپنے پس منظر کے لحاظ سے دونوں نصاب ایک حد تک اچھے ہی تھے۔ ثانوی کا نصاب یونیورسٹی سے فارغ طلبہ جن کی عمر ۲۱، ۲۲ سال ضرور ہو جایا کرتی تھی، کے لحاظ سے بنایا گیا تھا کہ وہ فکری اور جسمانی اعتبارات سے بڑے بڑے موضوعات کو بہت جلد اور آسانی سے ہضم کر سکتے ہیں جب کہ مدرسۃ الاصلاح کا نصاب ۶ سال کے بچے سے لے کر ۱۷، ۱۸ سال میں فارغ ہو جانے کے لیے بنایا گیا تھا۔

ان دونوں کا سنگم آپ اس نصاب میں دیکھ سکتے ہیں جو اس کمیٹی نے بنایا ہے جس کی صدارت کا شرف مجھے حاصل تھا۔ یہ نصاب جامعہ دارالہدیٰ، حیدرآباد دکن کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آپ اسے جناب اشفاق فلاحی صاحب کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں جنہیں وائس پرنسپل جامعہ دارالہدیٰ جناب عبدالصمد العمودی سے اسے حاصل کرنا ہوگا۔ اگر یہ کمپیوٹر میں محفوظ ہے تو ایک سکنڈ میں آپ کے پاس ہوگا۔

(۱۱)

۱۔ جن بلند مقاصد کے لیے ثانوی درس گاہ وجود میں آئی تھی، آپ کے خیال میں ان کے حصول میں اسے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی؟

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ مختلف عوامل کی بنیاد پر اسے بند کر دینا پڑا۔ اس لیے کامیابی کا انحصار فردی کوششوں پر ہوگا۔ اجتماعی کوششوں پر نہیں رہا۔ کاش ما بعد التخرج After graduation what? کی سوچ ہوتی تو بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے تھے اور آج بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔

۲۔ کیا آپ کے خیال میں ایسی کوشش پھر کی جانی چاہیے؟ اگر ہاں تو عربی/اسلامیات کا وہی نصاب تعلیم نافذ ہو یا تبدیل شدہ؟ اگر تبدیل شدہ تو تبدیلی کس انداز کی ہو؟

میرا خیال کیا بلکہ مطالبہ ہے کہ ایسی کوششیں آج اور کل بھی کی جانی چاہییں۔ دیکھیے زمانے کے ساتھ

ساتھ سوائے عقائد اور عبدادات کے ہر چیز بدلتی ہے۔ اس لیے کمپیوٹر کے وجود کے ساتھ بہتر سے بہتر نصاب بنایا جاسکتا ہے جس میں عصری علوم کے تخصص specialisation کا بھی پورا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر اچھے اساتذہ میسر آ جائیں تو دینی وعصری علوم کو جمع کرنے والے طلبہ کو تحریک اسلامی میں بھی قیادتی سطحوں پر جذب کیا جاسکتا ہے اور گہرے علمی پراجکٹس پر انہیں لگایا جاسکتا ہے۔ بہر حال مال اور افراد (طلبہ/ اساتذہ) دونوں موجود ہوں تو سونے پہ سہاگا ہو جائے گا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ اس وقت کے اساتذہ کرام یکطرفہ علم کے حامل تھے لیکن آج ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب، ڈاکٹر عبدالباری صاحب سے قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ پڑھائے جائیں تو طلبہ کی علمی نوعیت quality کئی درجے بلند ہوگی۔ اس کے پہلو بہ پہلو اگر غیر نصابی علمی سرگرمیاں بھی اچھے پیمانے پر ہوں تو طلبہ بہت کام کے بن کر فارغ ہو سکتے ہیں۔

ہم لوگوں میں جوہری کی نظروں کی نہ صرف کمی ہے بلکہ فقدان ہے۔ مرحوم برادرم عبدالحق انصاری صاحب نے اس قسم کی درس گاہ قائم کی تھی۔ مگر مجھ سے حیدرآباد میں ملاقات کے بعد بھی انہوں نے مجھ سے آ کر ایک نظر ڈالنے کے لیے نہیں کہا کجا کہ وہ مجھے نصاب سازی میں اور تدریس میں شرکت ہونے کے لیے کہتے۔ یہ بہت بڑا سانحہ ہے جس کا میں ہمیشہ سے شاکی رہا ہوں۔ یہی نہیں مولانا جلال الدین صاحب کو، جو ہم درس رہے ہیں، بھی میں نہیں دکھائی دیا۔ ساری جھک ماری اور مغز پاشی خود ہی کرنی پڑتی ہے اس لیے اس کے نتائج کسی کو نظر نہیں آتے۔ اس طرف خاص توجہ دیجیے۔ اگر آپ (رضوان بھائی) کچھ کرنا چاہتے ہیں تو باصلاحیت لوگوں کو جمع کرنا اور ان سے کام لینا دو چار کتابیں لکھ دینے سے بہت بہتر ہے۔ کیونکہ ادارتی شکل دے کر institutionlaised اس کو بہت عرصہ تک زرخیز اور ثمرآور بنا دیتے ہیں۔ کاش مولانا مودودی صاحب اپنی نگرانی میں ایسے دس بیس لوگوں کو تربیت دیتے۔

خورشید بھائی سے میں کئی بار اسٹراٹیجک اسٹڈیز سنٹر قائم کرنے کی اپیل کر چکا ہوں۔ مصر میں اخوان کی جو گت بنی ہے اس کے لیے وہ اس وجہ سے معذور ہیں کہ وہ جیلوں میں بند تھے۔ مگر جیلوں سے باہر رہنے والوں کے پاس کیا عذر ہے؟ مرسی صاحب بار بار غلطیوں کا اعتراف کر چکے ہیں لیکن لوگ اعتذارات سننے کے لیے تیار نہیں۔ یہی بات دینی اور سیاسی امور میں مجتہدین مطلق پیدا کرنے کے لیے بار بار کہہ چکا ہوں کوئی سنتا ہے اور نہ سننا ہی چاہتا ہے۔

(۱۲)

۱- درس گاہ کے جو فارغین تحریک اسلامی سے وابستہ رہے اور بیش بہا خدمات انجام دیں؟ آپ ان کی خدمات کو کس طرح evaluate کرتے ہیں؟

۲- جو فارغین تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے ان کی خدمات کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

اوپر دونوں موضوعات پر اظہار خیال کر چکا ہوں۔ بہت کچھ ہوسکتا تھا اگر ثانوی درس گاہ بند نہ ہوتی، اس کا نصاب بہتر ہوتا اور اساتذہ صرف پڑھانے کے لیے فارغ ہوتے۔

(۱۳)

۱- آپ کے خیال میں ثانوی درس گاہ کے نہج پر کیا کوئی ادارہ اس وقت ہندوستان میں قائم ہے؟ اگر ہے تو اس سے آپ کا کسی قسم کا ربط ہے؟

عرض کر چکا ہوں کہ برادرم عبدالحق انصاری صاحب نے ایسی درس گاہ قائم کی تھی اور وہ آج بھی کام کر رہی ہے۔

۲- ہندوستان میں تعلیم کے میدان میں آپ ثانوی درس گاہ کے contribution کو کس طرح evaluate کرتے ہیں؟

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی صاحب اور ڈاکٹر عبدالباری صاحب کے contributions معروف و مشہور ہیں۔ البتہ مجھے یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ میرے ایک انگلش کتابچے Al-Murabaha in Theory and Practice پر ڈاکٹر خالد وحید صاحب نے برادر عزیز ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب کے ایماء پر اور ڈاکٹر فریدی صاحب اور ڈاکٹر نجات اللہ صاحب کے مشوروں سے ریسرچ کیا اور علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان سے حیدرآباد میں بار بار ملاقات ہو چکی ہے۔ ابھی ان کا مقالہ چھپا نہیں اور نہ میں نے ہی اسے پڑھا ہے۔ مزید معلومات آپ ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب سے حاصل کر سکتے ہیں۔

ہاں آخری تیسویں پارے کا ترجمہ اور تفسیر انگریزی میں میرے (الکاف) کے قلم سے چھپ گئی ہے۔ ایک ہزار نسخے تقریباً بک چکے ہیں۔ آسٹریلیا کے برادر مکرم اشفاق صاحب نے اس کو پسند کیا اور online ڈالنے کی اجازت چاہی جس کی منظوری میں نے دے دی ہے۔ پورے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ اور

تفسیر لکھ چکا ہوں۔ دعا کیجیے کہ وہ جلد از جلد منظر عام پر آجائے۔ اس کا نام The Simplified Qur'an ہے۔ اردو میں ترجمہ اور تفسیر کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ اس پر تبصرے اچھے اور ہمت افزا شائع ہوئے ہیں۔ شاید آپ مطالعہ کے لیے اسے لیسٹر سے حاصل کر سکتے ہیں۔

دیگر حضرات کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے۔ صرف سنی سنائی باتیں ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی فلسفہ پر کتابیں اور ڈاکٹر راؤ عرفان خاں صاحب آف شکاگو کی کتابیں۔ اتنا ضرور ہے کہ اشفاق بھائی آف آسٹریلیا نے اس علاقے میں خدمت اسلام کا کام بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ان کے ایک کتابچے کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر چکا ہوں۔ آپ ان سے دریافت کر لیں۔

۳- ثانوی درس گاہ سے جو تعلیمی تجربات آپ کو حاصل ہوئے انہیں اگلی نسل/ ہم خیال دینی تدریسی اداروں تک منتقل کرنے میں آپ کی عملی کوششیں کیا رہی ہیں؟

ان تجربات کو ایک حد تک میں نے جامعہ دارالہدیٰ حیدرآباد دکن کے نصاب تعلیم میں، میں نے منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی خاطر جامعۃ الفلاح، مدرسۃ الاصلاح، دارالمصنفین، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور مئو کے اہل حدیث حضرات کے مدرسوں کا میں نے دورہ کیا، اساتذہ اور منتظمین سے ملا اور بات چیت کی۔ بعض کلاسز میں گیا، ان کے نصاب تعلیم حاصل کیے اور ان کا مطالعہ کیا۔ ادھر یمن، سعودیہ اور بعض دیگر ممالک مثلاً کویت اور ایک حد تک مصر کے نصاب تعلیم سے بھی استفادہ کر کے عربی زبان وادب، تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ میں نئی درسی کتابیں داخل کیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہر درجہ میں عصری علوم کی تدریس کچھ اس طرح کی کہ یہاں سے فارغ ہوتے ہوتے طالب علم مقامی (ریاستی) نصاب تعلیم میں FA یا BA میں داخلہ لینے کے لیے امتحان دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس سے کم از کم تین سال کی مدت بچا لیتا ہے کیونکہ وہ فراغت کے بعد دو سے تین سال عصری علوم کے امتحانات پاس کرنے میں صرف کر دیا کرتا تھا۔ الحمدللہ یہ دو سالہ نصاب تعلیم زیر تنفیذ رہا ہے۔ آپ اس کے نتائج کے بارے میں دارالہدیٰ وائس پرنسپل صاحب جناب عبدالصمد العمودی صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں۔ ان ہی سے یہ نصاب آپ اشفاق فلاحی صاحب کے ذریعہ حیدرآباد سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۴- ثانوی درس گاہ کے نصاب کی خوبیوں اور خامیوں کا تناسب آپ کے نزدیک کیا رہا؟

میں نے اس نقطۂ نظر سے ثانوی کے نصاب کی خوبیوں یا خامیوں پر کبھی غور نہیں کیا۔ اس کے باوجود میرا

احساس ہے کہ اچھے اساتذہ اور ذہین اور محنتی طالب علم ہوں اور پوری تعلیم ڈھنگ کے ساتھ دی جائے ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر جن کی طرف اشارات پچھلی سطروں میں گزر چکے ہیں تو وہ نصاب آج بھی ثمرآور ثابت ہوسکتا ہے اگر اس میں عصری ضروریات کا لحاظ رکھا جائے تو۔

۵- ثانوی درس گاہ کی بندش کے بعد افراد جماعت کی زیرنگرانی ملک کے طول وعرض میں اعلیٰ دینی تعلیم کے کئی ادارے قائم ہوئے۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ تصورتعلیم اور نصاب تعلیم، دونوں میدانوں میں یہ ادارے، بالخصوص 1960 کے عشرے میں قائم ہونے والے ادارے، ثانوی درس گاہ سے شعوری یا غیرشعوری طور پر بڑی حدتک inspired ہوئے ہیں؟

inspired نہیں ہوئے ہیں سوائے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے ادارے کے۔ کیونکہ یہ سب چھوٹے بچوں کو لے کر ان کو درس نظامی کے نصاب میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے پڑھاتے ہیں۔ ثانوی کا مقصد بالکل مختلف اور اس کا پس منظر الگ تھا۔ ان میں انگریزی اور بڑی حدتک خود عربی بھی ''تبرک'' کی حدتک پڑھائی جاتی ہے۔ عصری علوم جیسے سائنس، حساب، تاریخ وجغرافیہ وغیرہ یا تو بالکل ناپید ہیں اور اگر ہیں تو نہ ہونے کے برابر۔

٦- افراد جماعت کی زیرنگرانی قائم ملک میں اعلیٰ دینی تعلیم کے اداروں اور ثانوی درس گاہ کے نصاب ومعیارتعلیم کے درمیان آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟ کیا مماثلتیں ہیں اور کیا خامیاں ہیں؟ بحیثیت مجموعی آپ کسے بہتر تصور کرتے ہیں؟

افراد جماعت کی طرف سے قائم کردہ مدارس اور ثانوی درس گاہ میں مقابلہ ایک کوشش عبث ہے۔ ان اسباب کا بار بار ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

۷- آپ کی صلاحیتوں کے نشوونما میں ثانوی درس گاہ کی تعلیم کس حدتک معاون ثابت ہوئی؟ براہ کرم قدرے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالیے۔

ثانوی درس گاہ اور مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم نے مجھے عالم عربی میں جمنے میں بہت فائدہ زیادہ پہنچایا۔ میں عربی النسل ہوں اور حضرموت (یمن) سے میرا خاندانی اور قبائلی تعلق ہے۔ عربی زبان وادب میں اچھی خاصی استعداد پیدا ہو جانے کی وجہ سے میں بہت جلد عرب ماحول میں کھپ سکا۔ پھر یونیورسٹی کی تعلیم نے بھی میرا ساتھ دیا۔ اس لیے میں ہمیشہ عدن (یمن) اور جدہ پھر صنعاء میں اچھی آمدنی کماتا رہا ہوں تدریس، ترجمہ

اور ادارتی میدانوں میں کام کرتے ہوئے۔ الحمدللہ میں بہت سے میدانوں میں کافی کامیاب رہا ہوں دینی اور عصری تعلیم دونوں سے آراستہ و پیراستہ ہونے کی وجہ سے۔ اس پر بکثرت اسفار کے مواقع ملے۔ ان سے بڑی تنخواہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے تین کتابچے اپنے خرچ پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی سے شائع کروائے۔ ان کی اشاعت میں برادر عزیز منور صاحب اور برادر عزیز خورشید صاحب کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جزاہما اللہ خیراً۔

اجتہادی میدان میں میری کوششیں ان کتابچوں کے علاوہ اس کتاب میں جو میں نے مصادر زکاۃ میں توسیع کی ضرورت اور اس نظریے میں جس کو میں نے Equitable Distribution of Risk Concept کا نام دیا ہے، ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ اجتہادی کوششیں آپ ترجمہ و تفسیر (اردو اور انگلش) دونوں میں بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ گو یہ معمولی اور چھوٹی چھوٹی کوششیں ہیں، لیکن اگر مجھے کسی ادارے میں بٹھا کر کام کرنے کا موقع ملتا تو وہ چمک کر سامنے آتیں۔ فردی کوششیں ہونے کی وجہ سے وہ اپنا مقام حاصل نہیں کر سکیں۔

کراچی میں جو مقالات میں نے انگلش میں شائع کیے ہیں، ان میں سے چند اچھوتے خیالات سے عبارت ہیں اور مقالات میں جو قرآنی اور دینی موضوعات پر ہیں وہ اہل حدیث حضرات کے ہفت روزہ 'الاعتصام' لاہور میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں بھی اپج آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

میں نے اچھی خاصی تعداد میں اردو، انگلش اور عربی میں عثمانیہ یونیورسٹی، English & Foreign Langauges University (EFLU) حیدرآباد اور مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد میں لیکچرز دیے ہیں اور مقالات پڑھے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ کے اسلامک اکنامکس ریسرچ سنٹر کے سہ ماہی بلند پایہ رسالے میں میرا ایک نوٹ زکاۃ کے نئے مصادر پر عربی میں ڈاکٹر مصطفیٰ زرقاء صاحب کے مقالے پر نکل چکا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے سالانہ رسالہ "التنویر" کے یمنی ایڈیشن کو جو عربی میں تھا میں نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس میں عربی میں یمن پر میرے سارے مقالات شامل ہیں۔

سد مآرب، اور قوم ہود اور قبر نبی اللہ ہود پر میرے سفری تاثرات کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ان کے دو تین اقتباسات اطلس القرآن (اردو) اور اطلس السیرۃ النبویۃ (اردو) میں شائع ہو چکے ہیں جن کو الریاض سے بڑے خوب صورت طرز پر اہل حدیث حضرات نے شائع کیا ہے۔ اس ادارہ کا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہے تو یہاں درج کر دیں۔ ہاں الاعتصام لاہور کا پتہ ہے: 33 Shish Mahal Road, Lohore۔

۸- ثانوی درس گاہ کا تجربہ آزاد ہندوستان میں ایک منفرد اور اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا۔ قیاس ہے کہ

اس کے نصاب کی تیاری میں غیر جماعتی افراد و ماہرین سے بھی مشاورت کی گئی ہوگی۔ کیا آپ کے علم میں ہے کہ کن غیر جماعتی شخصیات سے مشاورت ہوئی ہوگی اور ان کے کیا مشورے رہے ہوں گے؟ نیز ان کے علاوہ غیر جماعتی حلقوں میں کس حد تک ثانوی درس گاہ کے تصور اور نصاب کو، نظری طور پر ہی سہی، پذیرائی حاصل ہوسکی؟

خود جماعت میں اس تصور کو اور نصاب کو نہ تو اس وقت پذیرائی ملی اور نہ آج۔ کیونکہ میرے تیار کردہ نصاب پر جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے ان علماء کو جو ارکان جماعت ہیں سخت اختلاف بلکہ غصہ ہے۔ ان کے نزدیک میں نے ''مقدس'' درس نظامی پر اس کے ذریعہ دست درازی کی ہے۔ برعکس اس کے مولانا سیف اللہ رحمانی صاحب جو مشہور عالم دین ہیں اور کبھی جامعۃ الہدیٰ کے استاذ بھی رہے ہیں اور میری ان کی جان پہچان بھی ہے انہوں نے نئے نصاب کی بھنک سن کر اس کو یہ کہہ کے منگوایا کہ وہ مولانا آزاد یونیورسٹی کے نوزائیدہ ''شعبہ اسلامیات'' کے نصاب کمیٹی کے ذمہ داروں میں سے ہیں اور اس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ بعد میں عبد الصمد العمودی صاحب نے بتایا کہ مولانا آزاد یونیورسٹی جو اردو یونیورسٹی ہے، کے شعبہ اسلامیات کے نصاب میں تقریباً 40% حصہ جامع دارالہدیٰ کے نئے نصاب سے لیا گیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ باہر کے حلقوں میں اگر دارالہدیٰ کا نصاب شائع کردیا جائے تو اسے جماعتی حلقوں سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوگی۔ اس کی اشاعت کا وعدہ سابق صدر شعبہ اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی، جناب پروفیسر انور معظم صاحب نے جناب جلال الدین عمری صاحب کے داماد ڈاکٹر خالد المظفر سے لیا تھا۔ کیونکہ وہ نئے نصاب تعلیم برائے مدارس عربیہ کے بارے میں شکایت کررہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ کام ہوچکا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور میں ڈاکٹر خالد ظفر صاحب کو ڈھونڈ کر لے آیا اور انور معظم صاحب سے کہا کہ آپ خود ان سے کہیے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم اس نصاب کو شائع کریں گے۔ مجھے اب صنعاء میں سات ماہ ہو رہے ہیں، نہیں معلوم وہ شائع ہوا یا نہیں۔ آپ جناب اشفاق اصلاحی کے ذریعہ عبدالصمد العمودی صاحب سے اس کی کاپی طلب کرسکتے ہیں اور اشاعت کے بارے میں سوال بھی کرسکتے ہیں۔

۹- کیا آپ کے زمانہ میں کبھی کسی غیر جماعتی نمایاں شخصیت نے بغرض جائزہ درس گاہ کا معائنہ کیا؟ اگر ہاں تو کن تاثرات کا اظہار کیا؟

کسی غیر جماعتی شخصیت نے ہماری درس گاہ کا ہمارے زمانے میں معائنہ نہیں کیا۔

۱۰- ثانوی درس گاہ کے ذریعہ کیے جانے والے تعلیمی تجربہ کو آپ مجموعی طور سے کس طرح evaluate

کرتے ہیں؟ اگر آپ کے قلم سے ثانوی درس گاہ پر کوئی تعارفی/ تاثراتی/ تجزیاتی/ تنقیدی تحریر اردو/ انگلش/ عربی یا کسی اور زبان میں شائع ہوئی ہو تو براہ کرم اس کی نقل عنایت کیجیے۔

میں اس تجربے کی تقییم evaluation اس کے نقائص کے باوجود یوں کرتا ہوں کہ اس درس گاہ کا تصور اور نصاب اپنے زمانے (1950-1960) میں ایک landmark تھا۔ اگر اسے جاری رکھ کر اس کو مزید ترقی اور توسیع دی جاتی تو وہ ایک منارہ نور بن کر ابھرتا۔ وللہ الامر من قبل و من بعد۔

ڈاکٹر نجات اللہ صاحب کے کہنے پر میں نے ایک تحریر برادرم ڈاکٹر عبدالباری (شبنم سبحانی) صاحب کے یہاں روانہ کردی تھی جس کو وہ ایک reference کی حیثیت سے ثانوی درس گاہ پر اپنی کتاب میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ آپ ان سے دریافت کرلیں۔

حبیب حامد عبدالرحمٰن الکاف

صنعاء، الیمن

جمعرات ۴۰-۱۱ قبل الظہر

۲۵ شعبان ۱۴۳۴ ہجری/ ۴ جولائی ۲۰۱۳ء

۱۰ رمحرم: یومِ خلافتِ راشدہ

مفتی صباح الدین ملک فلاحی قاسمی

نئے اسلامی سال کا آغاز

آج اسلامی قمری کیلنڈر کا پہلا مہینہ محرم الحرام ۱۴۴۳ چودہ سو تینتالیس ہے، یعنی ہجرتِ مدینہ کو چودہ سو بیالیس (۱۴۴۲) سال گزر چکے ہیں۔ مسلمانانِ عالم ایک نئے سال کا آغاز کر رہے ہیں۔ ہمیں اور آپ کو چودہ سو اکتالیس ہجری کا یہ 'نیا سال مبارک' ہو۔

نبی ﷺ ہر مہینے کا نیا چاند دیکھ کر یہ دعا مانگتے تھے:

اللھم اھله علینا بالامن والایمان و السلامة والاسلام و التوفیق لما تحب و ترضی.

اے اللہ ہم پر یہ مہینہ امن وامان اور سلامتی واسلام کے ساتھ طلوع کر اور ہمیں اپنے پسندیدہ اعمال کی توفیق عطا فرما، آمین۔

اسی طرح ہم پورے سال کے لیے امن وامان اور سلامتی واسلام اور توفیقِ اعمال صالحہ کی دعا کرتے ہیں۔

عاشوراء اور روزہ

اس ماہ کی دس (۱۰) تاریخ، یعنی یومِ عاشوراء ایک نفلی روزے سے منسوب ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی ﷺ مدینہ آئے تو آپ نے مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کی ہدایت کی۔ رمضان کی فرضیت کے بعد عاشوراء کا یہ روزہ محض ایک مستحب عمل قرار پایا۔ ہم اور آپ چاہیں تو بطورِ نفل یہ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ حضور ﷺ کو بتایا گیا کہ اسی دن قوم بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں فرعون سے نجات ملی تھی، اسی لیے یہودی اس دن روزہ رکھتے ہیں۔

عاشوراء اور شہادتِ حسین

دس محرم عاشوراء کا دن، اُس وقت اسلامی تاریخ کا انتہائی اہم دن بن گیا، جب یزید بن معاویہ کے ایک

کمانداروں نے نبی ﷺ کے نواسے حضرت حسینؓ کے خانوادے کا قتلِ عام کیا۔ تاریخِ عالم میں ایسا کوئی دوسرا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ کسی امت نے اپنے ہی نبی کے خاندان کو اس طرح قتل نہیں کیا تھا۔ اِس واقعے نے پورے عالمِ اسلام پر ایک سکتہ اور لرزہ طاری کر دیا۔ ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی۔ آج کا دن ہر سال آکر امت کے اس زخم کو تازہ کر دیتا ہے۔ اس واقعے کا جب بھی تفصیلی ذکر آتا ہے کسی سچے مسلمان کے آنسو نہیں تھمتے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ان کے قاتلوں پر اور ان کے ہمنواؤں پر۔

حادثہ فاجعہ کا پس منظر اور اصل سبب

تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ کی ظالموں کے ہاتھوں شہادت ہوئی۔ حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت ہوئی۔ اس کے بعد بنو امیہ کے معاویہ بن ابی سفیان کی طرف سے حضرت عثمانؓ کے خون کے مطالبے کو بنیاد بنا کر حضرت علیؓ کی خلافت کا انکار اور بغاوت ہوئی، اور آخر کار حضرت علیؓ کی شہادت اور حضرت حسنؓ کی خلافت سے مجبورانہ دست برداری کے بعد زمامِ سلطنت مکمل طور پر معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھ میں آ گئی۔

یہ واقعات چالیس ہجری کے ہیں۔ بیس (۲۰) سال اسی طرح گزر گئے۔ ۶۰ ھ سے پہلے معاویہ بن ابوسفیان نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا دیا اور ان کی وفات کے بعد یزید کی تخت نشینی ہوئی۔

خلافت راشدہ کے بعد امیر معاویہ بن ابوسفیان کی ۲۰ سالہ حکومت اصلاً 'شاہی طرزِ حکومت' تھی، اگرچہ نام خلافت ہی کا تھا۔ ان کے بیٹے یزید کی تاج پوشی کے بعد صاف ہو گیا کہ اسلامی طرزِ حکومت یعنی خلافت کو ختم کر کے جاہلی طرزِ حکومت یعنی بادشاہت کو پھر سے امت میں رائج کر دیا گیا ہے۔ ایک قبیلے، بنی امیہ کی سیادت و قیادت اور بادشاہت کو پورے عالم اسلام پر بزور مسلط کر دیا گیا۔

دراصل اسی صورتِ حال کے خلاف حضرت حسین بن علیؓ نے صدائے احتجاج بلند کی، جس کا نتیجہ کربلا میں قتلِ عام کی صورت میں نکلا۔

اللہ تعالیٰ ان پاک نفوس پر رحمتوں کی بارش کرے، آمین۔

خلافتِ اسلامی کا فلسفہ

حضرت محمد ﷺ آخری نبی ہیں اور قیامت تک آپ کی نبوت اور شریعت نافذ ہے۔ آپ کی وفات ہو گئی مگر آپ کی رسالت ختم نہیں ہوئی، کیوں کہ کوئی دوسرا رسول اب آنے والا نہیں۔ اسی لیے سابق رسولوں کی طرح آپ کی نیابت اور خلافت قائم و دائم رہے گی اور امت کے اندر ہمیشہ خلافت کا نظام اور ادارہ قائم رہے گا۔

خلافت کے اس ادارہ کا کام امت کو مرکزیت فراہم کرنا، اس کی نگرانی وحفاظت کرنا اور اسے اپنے مشن پر قائم رکھنا ہے۔

شورائیت اور انتخاب

یہ خلافت ایک شورائی اور انتخابی نظام سے قائم ہوگی۔ اس کے برعکس بادشاہت اور ملوکیت، شورائی اور انتخابی نہیں ہوتی۔ 'بادشاہت' طاقت کے بل پر قائم ہوتی ہے۔ قوم کو محکوم اور غلام بناتی ہے۔ ملک اور قوم پر طاقت کے بل پر قبضہ کرتی ہے۔ ایک خاندان وراثتاً سب پر حکمران ہوتا ہے۔ ہر انسان کو اس بادشاہ اور اس کے خاندان اور اولاد کا وفادار رہنا ہوتا ہے۔

امت تین گروہوں میں منقسم

آج امت میں تین طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں:

ایک: امامت والے، دوسرے: ملوکیت والے، تیسرے: خلافت والے۔

۱- امامت والے

شیعہ حضرات 'خلافت' کو 'امامت' کہتے ہیں اور اسے صرف اہلِ بیتِ نبی میں محصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ وغیرہ خلیفہ نہیں، بلکہ امام ہیں۔ اور معصوم ہیں۔ اس لیے وہ لوگ انھیں 'رضی اللہ عنہ' نہیں بلکہ 'علیہ السلام' کہتے ہیں۔

۲- ملوکیت والے

یہ اہلِ تشیع کے مقابلے میں اپنے آپ کو اہلِ سنت کہتے ہیں اور معاویہ بن ابی سفیان اور ان کے بیٹے یزید بن معاویہ سے لے کر آج کے ملوک جیسے سلمان بن عبدالعزیز تک کی حمایت اور پیروی کرتے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جو صحابیت کی بنیاد پر انسان کو عملاً معصوم قرار دیتے ہیں اور ان کے ناجائز عمل کو بھی اسوہ اور نمونہ قرار دیتے ہیں۔

یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ 'صحابیت' مجموعی طور پر تین طرح کی ہے:

ایک صحابہ وہ ہیں جنہوں نے نبی ﷺ کی دعوت پر، اسلام کے حالتِ ضعف میں، دل و جان سے لبیک کہا، قربانیاں دیں اور آپ کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔

دوسرے صحابہ وہ ہیں جو بہت سوچ بچار کے بعد، کسی نہ کسی طرح ایمان لائے۔ بہت کم صحبتِ نبی پائی۔ کوئی خاص قربانی نہیں دی۔

صحابہ کا تیسرا گروہ دوسرے گروہ ہی کی طرح ہے، خاص طور سے جو مفتوح ہو کر مسلمان ہوئے۔ مزید یہ کہ اس گروہ نے اپنے عمل سے نظامِ امت کو نقصان پہنچایا اور تائب نہیں ہوئے۔

اللہ تعالیٰ سب کو معاف فرمائے، آمین۔

۳-خلافت والے

تیسرے 'خلافت' والے ہیں۔ یہ بھی اہلِ تشیع کے مقابلے میں اہلِ سنت ہوتے ہیں، مگر ان کے نزدیک 'ملوکیت' ایک جاہلی نظام ہے، جو طاقت کے بل پر جبر سے قائم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک شورائیت اور انتخاب سے ہی خلافت قائم ہوتی ہے اور 'وراثت' کے بدترین عیب سے بری ہوتی ہے۔

ہم اور آپ یقیناً 'خلافت' والے ہیں۔ خدا کرے جلد 'خلافت علیٰ منہاجِ نبوت' قائم ہو اور امتِ مسلمہ کو اپنا دینی، سیاسی اور اجتماعی مرکز میسر آئے۔

ضروری ہے کہ خلافت راشدہ کی سرزمین کے حدود میں خلافت کی بازیابی ہو۔ ان حدود کے درمیان واقع ملکوں کو جلد یہ کام کرنا چاہیے۔ اس وقت تک، ہم یہ کریں کہ اس دن کو 'یومِ خلافت' کے طور پر منائیں اور از سرِ نو قیامِ خلافت کا عزم کریں۔

اسلام اور مذہبی رواداری

فلاح الدین فلاحی

ملک عزیز سمیت پوری دنیا میں عدم رواداری اور رواداری پر بحثیں ہورہی ہیں۔ بطور خاص اسلام کی رواداری پر بھی سوالیہ نشان لگایا جارہا ہے، بلکہ دنیا یہ جاننا چاہتی ہے کہ اسلام میں رواداری کا کیا مقام ہے؟ ایسے حالات میں اسلام اور مذہبی رواداری کو چیلنج کیا جارہا ہے۔ اس لیے دنیا کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام مذہبی رواداری، اعتدال پسندی اور عدم تشدد کا حامل دنیا کا پہلا مذہب ہے، جس نے ہمیشہ نہ صرف یہود و نصاریٰ کے ساتھ بلکہ مجوس ومشرکین کے ساتھ بھی رواداری کا سلوک کیا ہے۔

اہل مغرب نے ہمیشہ اسلام اور ہادیٔ اسلام حضرت محمدﷺ کو بے جا الزامات کے ذریعہ بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ حال ہی میں ملک عزیز ہندوستان میں بھی یو پی کے ایک شخص کے ذریعے حضرت محمدﷺ کی شان میں گستاخی کا واقعہ پیش آیا اور متعدد مقامات پر اس کے خلاف مظاہرہ واحتجاج بھی کیا گیا، جس کو لے کر ملکی میڈیا میں کافی بحث وتکرار کا ماحول بھی دیکھا گیا۔

تاریخ انسانیت میں یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ کوئی مذہب یا نظریہ تلوار کے بغیر نہیں پھیلا۔ گویا تلوار اور جنگ، غلبہ دین اور افکار ونظریات کی ترویج کے لیے ایک ضروری چیز رہی ہے، مگر اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے جنگ کے اصول مقرر کیے۔ وگرنہ اسلام سے قبل دیگر مذاہب والے مفتوحہ اقوام پر جو ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے تھے، اس کی کچھ جھلکیاں ہم آج عراق، افغانستان اور شام میں دیکھ سکتے ہیں۔ ماضی میں اس کی بہت سارے مثالیں مل جائیں گی، لیکن ہم آج کے ماحول میں اس کا اندازہ با آسانی لگا سکتے ہیں۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملے وغیرہ اسی کی زندہ مثالیں ہیں، جہاں شہید ہونے والے عام انسان، عورتیں اور بچے ہیں۔ کس طرح وہاں ڈرون مسلم آبادی پر گرائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ہر طرف چیتھڑے بکھرے ملتے ہیں۔ روس اور فرانس کی، ملک شام میں حالیہ بم باری سے دنیا نے مشاہدہ کیا ہے کہ کس طرح آئی ایس

کے نام پر وہاں نسل کشی کی جاری ہے۔ یہ سب دیگر مذاہب کے نمائندے ہیں، جنھوں نے دنیا میں امن قائم کرنے کا ٹھیکہ اس انداز میں لیا ہے۔ بدقسمتی سے آج کچھ مسلم حکمراں بھی اس روشن خیال نظریہ کے حامی ہو گئے ہیں اور وہ بھی ٹھنڈے پیٹھ ان کے ظلم کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ جب کہ آں حضرتﷺ نے دورِ جاہلیت کے تمام وحشیانہ جنگی طریقوں کو منسوخ کر دیا اور ایسے قوانین نافذ فرمائے، جو آج بھی احترام آدمیت کا درس دیتے ہیں۔ ان قوانین کے مطابق جنگ کے دوران عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے قتل، عبادت گاہوں اور فصلوں کی تباہی و بربادی اور دشمنوں کے ہاتھ، ناک کان وغیرہ کاٹنے پر پابندی لگا دی گئی۔

دشمنانِ اسلام، اسلام کے بارے میں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ حالاں کہ اسلام بلند اخلاق و کردار اور دل کو موہ لینے والے انسانی اقدار کے ذریعہ پھیلا ہے۔ تاریخ میں کوئی ثابت نہیں کرسکتا کہ اسلام کو کسی پر زبردستی تھوپا گیا ہو۔ اس کے بالمقابل عیسائیت کے بزورِ بازو پھیلانے کے شواہد موجود ہیں۔ مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''نصرانیت-قرآن کی روشنی میں'' میں تفصیل سے لکھا ہے کہ عیسائی بادشاہ تھیوڈوسیوس نے غیر مسیحی عبادت کو موجبِ سزائے موت قرار دیا تھا۔ اس نے مندروں کو توڑنے، ان کی جائیداد ضبط کرنے اور عبادت کے سامانوں کو توڑنے کا حکم دیا تھا۔ مصر کے آرچ بشپ تھیوفیلوس نے خاندانِ بطالسہ کا عظیم الشان کتب خانہ نذرِ آتش کر دیا تھا۔ اس کے بعد مولانا مودودی لکھتے ہیں:

> ''ان مظالم کا نتیجہ یہ ہوا کہ بت پرست رعایا نے تلوار کے خوف سے اس مذہب کو قبول کرلیا جس کو وہ دل سے پسند نہیں کرتی تھی۔ بددل اور بے اعتقاد پیروؤں سے مسیحی کلیسا بھر گئے۔ ۳۸ برس کے اندر روم کی عظیم الشان سلطنت سے وثنیت (بت پرستی) کا نام ونشان مٹ گیا اور یورپ، افریقہ اور شرقِ اردن میں تلوار کے زور سے مسیحیت پھیل گئی۔''

اس کے بالمقابل ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے The"Preaching of"Islam میں کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں، بلکہ اخلاق وکردار کے زور سے پھیلا ہے۔ نیز مسلمانوں نے غیر مذہب والوں کو ہر جگہ مذہبی آزادی دی ہے۔ انھوں نے تفصیلاً لکھا ہے کہ کس کس جگہ عیسائی اقلیت میں اور مسلمانوں کے زیردست تھے۔ جنہیں بڑی آسانی سے بزورِ بازو مسلمان بنایا جاسکتا تھا مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر کسی جگہ بادشاہوں نے اس کا ارادہ بھی کیا تو مسلمان مفتیوں نے ان کو اس ارادے سے باز رکھا۔''

وہ مزید اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ اعتراف کرتا ہے:

> ''کوئی مذہب اسلام کی طرح روادار اور صلح کل نہیں ملے گا جس نے دوسروں کو اس طرح

مذہبی آزادی دی ہو- رواداری مسلمانوں کی طبیعت کا ایک محکم خاصہ اور مکمل مذہبی آزادی ان کے مذہب کا دستور العمل رہا ہے۔''

اسلام مذہبی رواداری میں یقین رکھتا ہے۔اسلام ہی دین حق ہے، ساری دنیا کی نجات صرف اسلام میں ہے۔ اسلام کے علاوہ جتنے بھی مذاہب ہیں جہنم کے راستے پر لے جانے والے ہیں، جنت کا دروازہ صرف اسلام ہے، یہ ہے اسلام کا ایسا ٹھوس عقیدہ جس میں وہ کسی بھی طرح سے سمجھوتے کا قائل نہیں۔اس عقیدے کی رو سے دیگر مذاہب کے پیروکار یہ ضرور کہیں گے کہ یہ عقیدہ تو عدم روادی پر منحصر ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ رواداری کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ دوسروں کو برداشت کیا جائے بلکہ اس کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دوسروں کے مذہبی عقائدواقدار، جذبات، تہذیب وثقافت وغیرہ کا لحاظ رکھا جائے۔ان کے تعلق سے عدم برداشت یا تحقیر کا ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے جو ان کے لیے قابلِ قبول نہ ہو اور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ اس طرح مذہبی روادی دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مذہب کے حوالے سے معیاری انسانی برتاؤ کا نام ہے۔ مذہبی رواداری کے حوالے سے قرآن وسنت میں صریح ہدایات موجود ہیں۔ اسلام عقیدہ توحید میں بے لچک موقف رکھتا ہے اور اس میں کسی سمجھوتے کا قائل نہیں، لیکن قرآن میں واضح اصول کے طور پر باطل معبودوں کو بھی برا بھلا کہنے سے سختی سے روک دیا گیا ہے۔ (الانعام :۱۰۸) اس لیے کہ اس سے جذبات مجروح ہوں گے۔ فریق مخالف کے مزاج میں اشتعال پیدا ہوگا اور وہ عین فطرت کے تقاضے کے مطابق جواب میں معبودِ حقیقی کو بھی برا بھلا کہنے لگیں گے۔ اسلام میں فریق مخالف پر رد کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، وہ خوب صورت اسلوب میں کی جانے والی بحث (جدال احسن، النحل :۱۲۵) ہے نہ کہ طنز و تشنیع اور نزاع پیدا کرنے والا طرز۔

اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ اسلام اپنا نظام زبردستی لوگوں پر تھوپتا ہے؟ نہیں بالکل نہیں، یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے جو لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ رواداری کے تعلق سے قرآن کا سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ: دین میں کوئی جبر نہیں۔ (البقرہ:۲۵۶) یہ انسان کی آزادی فکر وعقیدہ کا سب سے اہم اعلامیہ ہے۔کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی کے فکر وعقیدہ کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرے۔ ہر فرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس نظریے کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے رد کردے۔ اس کا محاسبہ کرنے والی ذات خدا کی ذات ہے، وہ قیامت کے دن اس کا محاسبہ کرے گی۔ دنیا میں اس بنیاد پر ایسے شخص کے ساتھ

برا اور غیر اخلاقی طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''اس لیے اے نبی تم اس دین کی طرف دعوت دو اور ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور کہو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے اس پر میں ایمان لایا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمہارا رب ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے''۔ (الشوری: ۱۵) حضرت عمرؓ کا ایک رومی غلام حضرت عمرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہا۔ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ وہ اسلام قبول کر لے تو وہ اسے کسی اہم عہدے پر فائز کر دیں لیکن اس نے اسلام قبول نہیں کیا اپنی وفات کے وقت حضرت عمرؓ نے اسے آزاد کر دیا۔ انسانی رواداری کا ایک اہم نمونہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کسی غیر مسلم کے جنازے کو بھی دیکھ کر اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ (بخاری) ہجرت کے بعد پیغمبرِ اسلام کو یہ قوت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ مدینہ میں قائم یہودیوں کی عبادت گاہوں کو مسمار کر دیں، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی بجائے آپ نے انھیں امتِ متحدہ کا حصہ بنا کر ان کے اندر پائے جانے والے نفرت و کدورت کے جذبات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ''میثاقِ مدینہ'' کے تحت مذہبی رواداری پر مبنی جو حقوق غیر مسلم فریقوں کو حاصل ہوئے ان میں سے دو یہ تھے:

ایک یہ کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو بھی مذہبی و سیاسی سطح پر وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ دوسرے یہ کہ دونوں فریق مل کر دشمنوں سے اس امت متحدہ کی حفاظت کریں گے۔ دونوں مل کر دفاعی اخراجات کے اور ذمہ داریاں اٹھائیں گے۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو کامل داخلی خود مختاری دی گئی ہے۔ چناں چہ قرآن کہتا ہے: ''عیسائیوں کو چاہیے کہ وہ انجیل کے مطابق فیصلہ کریں۔'' (المائدہ: ۴۷)

اہم بات یہ ہے کہ انجیل پوری طرح سے تحریف شدہ ہے۔ جس وقت قرآن نازل ہوا، وہ انسانی خرد برد کا شکار تھی، لیکن اس کے باوجود انھیں اس کی اجازت دی گئی۔ ان احکام کے تحت عہدِ نبوی ہی میں خود مختاری، آبادی کے ہر گروہ کو مل گئی تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے دین عبادت قانونی معاملات اور دیگر امور میں مکمل طور پر آزاد تھے، اسی طرح دوسرے مذاہب و ملت کے لوگوں کو بھی کامل آزادی حاصل تھی۔'' (ص: ۴۱۸) چنانچہ

فقہ میں یہ بات مسلّم ہے کہ اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہریوں کو اس بات کی اجازت حاصل ہوگی کہ وہ اپنی پسند کے کھانے اور پینے جیسے محرمات کا بھی اپنے نظریے کے مطابق استعمال کرسکیں۔ ان پر اس سلسلے میں کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ حالاں کہ اس بنیاد پر ایسا کیا جاسکتا تھا کیوں کہ کچھ ایسے کھانے اور پینے کی چیزیں وہ استعمال کرتے تھے جن کا تعلق عیسائیوں کے مذہب یا عقیدے سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ کئی اعتبار سے خود ان کے لیے بھی نقصان دہ ہے اسی کے ساتھ اسلامی سوسائٹی پر اس کا جو اثر پڑتا ہے وہ ظاہر ہے۔

اسلامی تاریخ میں، مذہبی رواداری کی قابلِ رشک مثالیں ملتی ہیں۔ دمشق کی مسجد کبیر کی توسیع کے لیے ولید بن عبدالملک نے ایک چرچ کے کچھ حصے کو اس میں شامل کرلیا جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انھوں نے مسجد کے اس حصے کو توڑ کر چرچ کو واپس کردیا۔ یہ مثالیں قرآن میں مذہبی رواداری کے تصور اور تلقین کے عین مطابق ہیں۔ قرآن میں کہا گیا ہے: ''تمھیں کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا رویہ اختیار نہ کرو، انصاف کرو۔'' (المائدہ:۸) مذہبی رواداری کی ایک اہم مثال اس آیت میں بیان کی گئی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ: اگر اللہ تعالیٰ آپس میں لوگوں کا ایک دوسرے کے ذریعے دفاع نہ کرتا رہتا تو غیر مسلموں کے عبادت خانے، گرجے مسجدیں، اور یہودیوں کے معبد اور وہ مسجدیں بھی ڈھادی جاتیں جن میں اللہ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ (سورہ حج:۴۰)

بہت سے مسلم حکم رانوں نے نہ صرف غیر مسلم عبادت گاہوں کی سرپرستی کی، ان کی تعمیر میں مدد کی، بلکہ خود سے اس کی تعمیر بھی کرائی۔ اس کی مثالیں عہد اموی میں بھی ملتی ہیں اور آج بھی متحدہ عرب امارات میں جس طرح دبئی کی حکومت نے وزیر اعظم نریندر مودی کو مندر بنانے کے لیے زمین دینے کی پیش کش یا منظور دی ہے، ساری دنیا نے دیکھا۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ صحیح ہے یا غلط؟ لیکن مذہبی رواداری کا ثبوت آج بھی مل رہا ہے۔ اس سے قبل ماضی میں مغلیہ سلطنت کے دور میں خود اورنگزیبؒ نے بنارس میں متعدد مندروں کے لیے زمین الاٹ کی تھی، جس کی کاپی بنارس ہندو یونیورسٹی کے میوزیم میں موجود ہے۔

ادھر کچھ ایسی مثالیں موجود ہیں، جس سے عدم رواداری کی جھلک ملتی ہے۔ لیکن اسے اسلام سے کسی صورت منسلک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح طالبان کے ذریعے گوتم بدھ کی مورتی کو توڑنے کی مثال اسلامی اصولوں سے انحراف کی مثال ہے۔ اسی طرح آج مختلف نیوز چینل پر آئی ایس نامی بدنام زمانہ تنظیم کی حرکتوں کو بھی دیکھا جارہا ہے، جس میں مورتی توڑنے سے لے کر انسانوں کے ساتھ وحشی اور درندے کی طرح سلوک

کیا جا رہا اور عورتوں کو باندی وغیرہ بنانے کی بات کہی اور دیکھائی جاری ہے، جس کو ان کے مطابق اسلامی اسٹیٹ کے نام سے موسوم کیا جا رہا ہے۔ ایسی انحراف کی دیگر مثالیں بھی مل جائے گیں، لیکن اس پر اسلام کے اصولوں کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ یہ جگ ظاہر ہے کہ وہ جو اقدامات کر رہے ہیں ان کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا اور ان کی وجہ سے عام مسلمانوں کی جان بھی جا رہی ہے۔ آج شام میں دنیا چڑھ دوڑی ہے صرف آئی ایس کے نام پر، حالانکہ وہاں نشانہ صرف عام انسان ہی ہیں، جس سے براہ راست فائدہ حکمراں طبقے کو مل رہا ہے اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ وہاں ہر طرف چیخ وپکار کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ لیکن آئی ایس کے پردے کے پیچھے اس پر تالیاں بجائی جا رہی ہے کہ یہ آئی ایس کا ٹھکانہ ہے۔ جب کہ روس سے لے کر فرانس تک، نے عام مسلمانوں کی بستیوں اور شہروں پر راست حملہ کر کے کھنڈروں میں تبدیل کر دیا ہے۔

لیکن کیا رواداری کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کھو دے؟ نہیں اور بالکل نہیں، مذہبی رواداری کے نام پر غیر مسلموں کا طریقہ اپنانا حرام ہے، اور ان کے مذہبی عقیدے اور تہواروں کی تائید کرنا کفر ہے، غیر مسلم کو اپنے مذہب پر چلنے کا پورا اختیار ہے لیکن مسلمان اگر ان کے عقیدے کی تائید کریں تو خود ان کا اسلام ہی باقی نہیں رہے گا۔ اسلام ایک آفاقی دین ہے، جو کسی سہارے کا محتاج نہیں، مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں عقائد، عبادات، معاملات اور پرسنل لا میں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی شریعت کی تابعداری کریں۔ اسی لیے سنن ابی داؤد کی روایت کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں''۔ (سنن ابوداؤد: ۱۳۰۴)

ہندوستان میں رواداری کا مفہوم کچھ بدل گیا ہے۔ خود مسلم سیاسی لیڈران سے لیکر مذہبی رہنما تک برادران وطن کے مذہبی تیوہاروں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کے مذہب کے مطابق وہ سارے افعال انجام دیتے ہیں جس کے کرنے سے ایک مسلمان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اسے وہ مذہبی رواداری کا نام دیتے ہیں جو سراسر غلط ہی نہیں بلکہ شرک ہے۔ مذہبی رواداری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ان کی مشابہت اختیار کریں، اور نہ یہ ہے کہ ہم ان کے تیوہاروں میں حصہ لیں۔ یہ امر واقع ہے کہ آج دنیا میں مساوات، امدادِ باہمی، علمی جدوجہد اور نوع انسانی کے ساتھ ہمدردی کی جو تحریکیں جاری ہیں وہ سب کی سب اسلام ہی سے مستعار لی گئی ہیں۔ اسلام نے جلوہ گر ہو کر حکومتی نظاموں کا ڈھانچہ بدل دیا۔ دنیا کے اقتصادی نظام میں انقلاب برپا کر دیا۔ اسلام نے ایک ایسا مکمل نظامِ حیات پیش کیا جو مسلمانوں ہی کیلئے نہیں بلکہ ساری دنیا کیلئے ایک رحمت ثابت

ہوا۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں جن کے سامنے نہ صرف میری بلکہ ہر انصاف پسند انسان کی گردن جھک جانی چاہئے۔

مذہبی رواداری کے تعلق سے ہمیں صرف اصولی قوم ہی نہیں کہ وہ رواداری کے اصول ونظریات میں یقین رکھتی ہو بلکہ عملی قوم بھی ہونا چاہیے۔ مذہبی راوداری کی وہ روشن مثالیں جو ماضی میں ملتی ہیں، حال میں بہت کم ہوگئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصول ونظریات کے حوالے سے جب بھی ہمیں مثالیں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ہم عموماً اپنے ماضی سے ہی اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ماضی میں ہماری ذہنیت دین کی اصولی تعلیمات وہدایات کی روشنی میں تشکیل پائی تھی۔ حال میں ہمارا ذہن موجودہ سیاسی حالات وواقعات سے زیادہ متاثر ہے۔ بلکہ بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسی نے ایک اصول کی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ جو تمہارے ساتھ جیسے کرے تم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کرو۔ حالانکہ رسول اللہؐ کی تعلیم یہ ہے کہ: ’’تم موقع پرست مت بنو کہ کہنے لگو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا معاملہ کریں گے تو ہم ان کے ساتھ اچھا معاملہ کریں گے اور اگر وہ ہمارے ساتھ برا معاملہ کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ برا معاملہ کریں گے، بلکہ تم خود کو اس بات کا عادی بناو کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی برائی کے ساتھ پیش آئے تو تم بھلائی کے ساتھ پیش آو۔ عیسائیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو۔ ظاہری طور پر یہ چیز انسان کی عام فطرت سے ہٹ کر محسوس ہوتی ہے، قرآن میں اس سے ملتی جلتی بات یہ کہی گئی ہے کہ: ’’تم برائی کو بھلائی سے دفع کرو۔ جب تم ایسا کروگے تم دیکھوکہ تمہارا کٹّر دشمن بھی تمہارا گہرا دوست ہوگیا۔‘‘ (فصلت:۳۴)

مذہبی رواداری کے مفہوم کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے حالات وواقعات میں بھی جن کی براہِ راست زد ہم پر پڑتی ہو، کھلا ہوا نقصان ہمارے سامنے ہو، ہمیں وسیع القلبی کے ساتھ اس کی پاس داری کرنی چاہیے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ نیکی خود اپنا انعام ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم جو نیکی کررہے ہوں ہمیں اس کی متوقع اور پسندیدہ جزا بھی ملے۔ اس وقت اسلامی اصولوں پر فخر کی بجائے ان کو برت کر دکھانے کی ضرورت ہے۔ ایک داعی قوم کی حیثیت سے ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ وسیع النظری اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کریں، اس سے قطع نظر کہ دوسروں کا معاملہ ہمارے ساتھ کیا ہے۔ یہی رسول اللہ ﷺ کا اسوہ اور اصحابِ رسول کی سنت ہے۔

ہندوراشٹر کی طرف بڑھتے قدم

محمد غالب فلاحی

تاریخی پس منظر

۱۹۲۵ء میں سرزمین ہند میں آر ایس ایس کی بنیاد رکھی گئی، جس کا مقصد ہندوستان کو (جو مختلف مذاہب اور قوموں کا سنگم ہے) ہندوراشٹر بنانا، ایک قوم کو فوقیت دینا اور دیگر اقلیتوں کو ہندو سماج میں ضم کر دینا یا انھیں ملک سے باہر نکال دینا ہے۔ اس تنظیم کے سربراہوں نے آزادئ ہند کے لیے ذرا بھی کوششیں نہیں کیں، بلکہ اس کے برعکس انگریزوں کے ساتھ مل کر بھارت واسیوں سے غداری ضرور کی۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے بعد سے ہندوستان میں طویل عرصہ کانگریس کی سرکار رہی۔ کانگریس کے زمانۂ حکومت میں آر ایس ایس پر پابندیاں عائد ہوئیں، لیکن آر ایس ایس کی بڑھتی مقبولیت کی وجہ سے سیاسی مفاد کی خاطر اس پر سے پابندی ہٹالی گئی اور آر ایس ایس پر زور انداز میں اپنا کام کرتی رہی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض معاملات میں کانگریس، آر ایس ایس کے مطابق ہی چلتی رہی ہے۔

۱۹۸۰ء میں آر ایس ایس نے اپنی ایک سیاسی پارٹی بنائی، جسے ہم بی جے پی کے نام سے جانتے ہیں۔ اس پارٹی نے ابتدا ہی سے ہندتوا اور ہندوؤں کے لیے آوازیں بلند کرتی رہی اور اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کے خلاف زہرافشانی کرتی رہی۔ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آیا۔ اس میں بی جے پی پیش پیش رہی اور ہندوستانی سیاست کا رخ تبدیل ہو گیا۔ ہندوؤں کے اندر مسلمانوں کے تئیں نفرت بڑھنے لگی، (کیونکہ آر ایس ایس نے زمینی سطح پر پرزور کام کیا) کمیونل رائٹس میں تیزی سے اضافہ ہوا، اور ہندو سماج میں بی جے پی کی مقبولیت بڑھی اور اقتدار میں آ گئی۔ اس زمانے میں گجرات فساد کا سانحہ پیش آیا۔ دوبارہ کانگریس سرکار میں آئی، اس نے دوسرے طریقے اپنائے اور مسلم طبقہ کے نوجوانوں کو مختلف من گھڑت تنظیموں کے نام پر دہشت گردی کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور کانگریس نے مسلم دشمنی کا ہمیشہ کی طرح سے ثبوت پیش کیا۔

اس وقت تک ہندوستانی عوام کا ذہن کلی طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ بالآخر ۲۰۱۴ء میں ایک بار پھر بی جے پی حکومت میں آئی اور پانچ سالوں تک مختلف طریقوں سے عوام کے ذہن کو جانچتی رہی۔ (خاص کر مسلم طبقہ کے افراد کے ذہن کو) موب لنچنگ، وندے ماترم، سوریہ نمشکار، یوگا، گائے کا تقدس اور تین طلاق کے ذریعے مسلم پرسنل لاء میں مداخلت جیسے بے شمار ایشوز کے ذریعے مسلم دشمنی کا ثبوت پیش کیا۔

۲۰۱۹ء کے الیکشن میں بی جے پی نے اکثریت سے حکومت بنائی اور الیکشن نے ہندوستانی عوام کی ذہنیت کو واضح تو کیا اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی بے بسی بھی واضح ہوگئی اور بی جے پی نے اپنا ہندتو کا رنگ دکھانا شروع کر دیا اور بی جے پی مینوفیسٹو میں کئے گئے اپنے وعدے کو پورا کرنے لگی سب سے پہلے تین طلاق بل کو پاس کرایا گیا حالانکہ راجیہ سبھا میں بی جے پی کی اکثریت نہیں تھی پھر دفعہ ۳۷۰ (کشمیر کو خاص حقوق دیئے گئے تھے) کو ہٹایا گیا اور اب بابری مسجد کا فیصلہ آیا آگے مزید کئی بل پاس کرانے کی تیاریاں ہو چکی ہیں جیسے NRC، CAB، یکساں سول کوڈ وغیرہ۔

پہلا قدم

دوبارہ حکومت میں آنے کے بعد بی جے پی اپنے اصلی رنگ میں نظر آنے لگی اور اپنے کئے ہوئے وعدے کے مطابق دفعہ 370A کو ختم کر دیا اور کشمیر کو دنیا کی سب سے بڑی جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ ابھی تک کشمیر کی حالت پر ساری دنیا کے نام نہاد حکمراں خاموش ہیں۔ یہاں تک کہ مسلم حکمران بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ کچھ دنوں تک انصاف پسندوں نے احتجاج کیا، لیکن وہ بھی خاموش ہو گئے۔ اہم بات یہ کہ دنیا بھر میں کشمیر کو لے کر ہندوستانی فیصلہ کی مخالفت کی گئی، لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ حکومت کے نشہ میں چور ہے، اسے دنیا کی پرواہ نہیں، ان کے اندر انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں، بس یہ اپنے مشن کے لیے آخری حد تک جا سکتے ہیں اور یہی بل/ فیصلہ ہندوراشٹر کی طرف بڑھتا ہندوستان کی وضاحت کرتا ہے۔

دوسرا قدم

۹/ اکتوبر ۲۰۲۰ء صبح کو بابری مسجد کا فیصلہ آیا۔ لیکن اس سے پہلے حکومت اور سنگھ پریوار کے لوگوں نے ملک میں حالات کو ہموار کرنے شروع کر دیے تھے، مسلم قائدین سے ملاقاتیں اور امن بنائے رکھنے کی اپیل نے واضح کر دیا تھا کہ یہ فیصلہ ایک طرفہ مسجد کے مخالف ہوگا۔ لیکن مسلم کمیونٹی کے لوگوں کو ہندوستان کی نام نہاد سیکولر عدلیہ پر پورا بھروسہ تھا، لیکن عدلیہ نے اس بھروسے کو بھی توڑ دیا اس فیصلے میں کئی خامیاں ہیں۔

فیصلہ آنے سے قبل میری کئی مسلم تنظیم کے ذمہ داروں سے اس مسئلہ پر بات بھی ہوئی میں نے کہا تھا کہ یہ فیصلہ ایک طرفہ اور بابری مسجد کے مخالف ہوگا کیونکہ کہ یہ آر ایس ایس اور ہندتو وادیوں کا اہم ایجنڈا تھا۔

ہندوؤں کا کوئی مرکز نہیں ہے، جیسا کہ دنیا کے سارے بڑے مذاہب کے مراکز ہیں سنگھ پریوار کو ہندوراشٹر قائم کرنا ہے، اس کے لیے ایک مرکز کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنا مرکز بابری مسجد کو بنایا۔ اس کی تیاری انھوں نے کئی دہائیوں پہلے سے کی اور اپنے ایجنڈے میں کامیاب رہے۔ یہ فیصلہ ہندوراشٹر کی طرف بڑھتا دوسرا بڑا قدم ہے۔ اسے مسلم عوام کو اور دوسری کمیونٹی کے لوگوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

تیسرا قدم

زعفرانی فکر کے حاملین کا مسلم قائدین کو ہائی جیک کرنا، بڑے کاموں میں سے ایک ہے۔ کیوں کہ مسلم کمیونٹی کو کنٹرول میں رکھنا ہے تو ان کے قائدین کو کنٹرول کرنا ہوگا۔ آر ایس ایس کے ہیڈ موہن بھاگوت نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ یہ ملک مسلمانوں کے بغیر ہندوراشٹر نہیں بن سکتا۔ یعنی جب تک مسلمانوں کو ہندو سماج میں ضم نہیں کر دیتے یا دوسرے درجے کا شہری نہیں بنا دیتے۔ تب تک ان کا خواب پورا نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے انھوں نے نام نہاد مسلم قائدین کو نشانہ بنایا اور اس میں کسی حد تک کامیاب رہے۔

چوتھا قدم

سنگھ پریوار کو سب سے زیادہ خطرہ مسلم کمیونٹی سے ہے۔ اس لیے انھوں نے موب لنچنگ کے ذریعے مسلمانوں کو خوف زدہ کیا، مسلم طبقہ میں پھوٹ ڈالی، مسلم عورتوں کو تین طلاق کے نام پر ورغلانے کی کوشش کی، مسلم قائدین کے امیج کو خراب کرنے کی کوشش کی تاکہ مسلم کمیونٹی کا ان پر سے بھروسہ اٹھ جائے اس کے لیے نام نہاد علماء اور قائدین کا بھرپور استعمال کیا گیا اور مزید مسلم کمیونٹی کو الجھانے کے لیے Bill Citizenship Amendment کو پاس کرانے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ دراصل اس کے ذریعے NRC کا راستہ ہموار کیا جا رہا ہے۔

۲۰۲۵ء میں آر ایس ایس کے سو سال مکمل ہو جائیں گے، اس سے قبل انھیں ہندوراشٹر کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے اور یہ اپنے مشن پر تیزی سے گامزن ہیں۔

مسلم عوام کو ان کے خطرناک مقاصد کو سمجھنا ہوگا، ہنگامی طور پر لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا، نام نہاد سیکولر پارٹیوں کے چنگل سے نکلنا ہوگا۔ نام نہاد مسلم قائدین کو بھی پہچاننا ہوگا، ان کے بہکاوے میں آئے بغیر اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔ اس بڑی جنگ کے لیے کمربستہ ہونا پڑے گا، قربانیاں دینی ہوں گی اور اپنے فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال کر ایک ساتھ مل کر سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔ اسلام کی تعلیمات پر خود عمل کرتے ہوئے لوگوں تک اس کی تعلیمات کو واضح اور دوٹوک انداز میں پیش کرنا ہوگا۔

●□●

انسٹاگرام کی سرگزشت

صوفیہ خان فلاحی

انسٹاگرام ایک سوشل میڈیا ایپلیکیشن ہے جس پر لوگ اپنی تصاویر اور ویڈیوز شیئر کرتے ہیں۔ انسٹاگرام کی ابتدا ۲۰۱۰ء میں ہوئی۔ اس وقت یہ ایپ صرف آئی او ایس یعنی ایپل کے لئے لانچ کیا گیا تھا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے دو سال بعد اسے اینڈرائیڈ موبائل کے لیے بھی لانچ کیا گیا۔ اس ایپ کو کیون سسٹروم نے اپنے ساتھی مائک کریگر کی مدد سے بنایا ہے۔

کیون سسٹروم سب سے پہلے گوگل میں پراڈکٹ مارکیٹر کے طور پر کام کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اس ملازمت کو چھوڑ کر نیکسٹ اسٹاپ (nextstop.com) میں کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے فوٹو شیئرنگ ایپ پر بھی کام شروع کر دیا تھا۔ ابتدائی دور میں اسے ایک کمپیوٹر پروگرام کے طور پر بنا کر بربن (burbn) نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ سسٹروم نے اس پروگرام کو پہلے پہل اپنے دوستوں اور قریبی لوگوں کے ساتھ شیئر کیا۔ اس کا کافی اچھا تاثر ملا۔ کچھ کمپنیوں نے بھی اس میں پیسہ لگانا شروع کیا۔ سسٹروم نے اپنے دوست مائیک کریگر کے ساتھ مل کر اس پروجیکٹ کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے خصوصیت سے صرف تصاویر شیئرنگ پر فوکس کیا اور مختلف قسم کے فلٹرز سے تصاویر کو خوبصورت بنانے کی سہولت فراہم کرنے پر توجہ دی۔ تقریباً آٹھ ہفتوں کی سخت محنت کے بعد بالآخر ۱۶/اکتوبر ۲۰۱۰ء کی رات کو یہ انسٹاگرام کے نام سے لانچ ہوا۔

انسٹاگرام کی اصطلاح انسٹنٹ کیمرہ اور ٹیلی گرام سے لی گئی۔ ایک رپورٹ کے مطابق پہلے ۲۴/گھنٹوں میں ہی اسے تقریباً ۲۵/ہزار سے زائد لوگوں نے ڈاؤن لوڈ کیا۔ اس ایپ نے بہت تیزی سے مقبولیت حاصل کی اور نو ماہ پورے ہوتے ہوتے اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد سات ملین پہنچ گئی۔ آج پوری دنیا میں تقریباً ایک ارب سے زائد لوگ اس کا استعمال کر رہے ہیں۔ امریکہ کی ایک تحقیق کے مطابق سوشل میڈیا ایپس میں یوٹیوب کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے۔

انسٹا گرام ایک ایسا ایپلکیشن ہے جو تصاویر پر مبنی ہے یہاں الفاظ اور آواز کی اہمیت ثانوی درجے کی ہے۔اس نوعیت کا یہ پہلا ایپ ہے اور یہی انفرادیت اس کی کامیابی کا راز ہے۔ بہت زیادہ ذاتی تفصیلات شیئر کیے بغیر آپ انسٹا گرام اکاؤنٹ بنا سکتے ہیں اور اپنی پسند کی تصاویر اور ویڈیوز شیئر کر سکتے ہیں، ساتھ ہی اپنے پسندیدہ لوگوں کو فالو کر کے ان کے بارے میں جان سکتے ہیں۔اس ایپ کو عام لوگوں سے لے کر سیاستداں اور فلمی ستارے سبھی استعمال کرتے ہیں۔ یہاں ہر کسی کے لئے ہر قسم کی تفریح کا سامان موجود ہے۔ یوٹیوب اور فیس بک کے مقابلے میں یہاں اشتہارات کی اتنی بھر مار بھی نہیں ہوتی۔اس کو استعمال کرنا بھی بہت آسان ہے اور اس میں پرائیویسی کے بھی آپشنز ہوتے ہیں جس کو استعمال کیا جائے تو اکاؤنٹ کی تفصیلات صرف وہی دیکھ سکتے ہیں جنہیں صارف خود اجازت دے۔اس ایپ کی مقبولیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ اب لوگ لمبی لمبی تحریروں سے بیزار ہوتے جارہے ہیں، وہ ویڈیوز اور تصاویر دیکھنا پسند کرتے ہیں، علاوہ ازیں جو لوگ لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا بہتر انداز میں نہیں لکھ پاتے یا اچھا لکھنے کے لیے درکار محنت سے جی چراتے ہیں...وہ بھی اس ایپ کے ذریعہ دوسروں تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں کیونکہ یہاں سب کچھ تصویروں کی زبانی ہوتا ہے۔ الفاظ کی بہ نسبت تصاویر زیادہ موثر ہوتی ہیں اور یہ ذہن کو جلدی اپیل کرتی ہیں۔انسٹا گرام نے تصویر کی اس طاقت کو اجاگر کیا۔اچھے سے کیپشن کے ساتھ کوئی بھی تصویر ڈال کر لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سیلفی کے جنون کو پروان چڑھانے میں انسٹا گرام کا رول انتہائی اہم ہے۔انسٹا گرام پر ہر روز تقریباً ۸۰ ملین تصاویر اپلوڈ کی جاتی ہیں۔اس پر سب سے پہلی تصویر کیون سسٹروم کے کتے کی تھی۔تصاویر اور ویڈیوز کے ساتھ مختلف قسم کے فلٹرز، کیپشن، گروپ میسج، ہیش ٹیگ، کمنٹس، اسٹوری فیچر، مینشن، ویڈیو ایڈیٹنگ، گروپ ویڈیو چیٹ اور لوکیشن شیئرنگ وغیرہ اسے صارفین کے لئے اور زیادہ دلچسپ بنادیتے ہیں۔

انسٹا گرام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے اسے فیس بک اور ٹوئیٹر کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ چنانچہ ۲۰۱۲ء میں فیس بک کے بانی مارک زکر برگ نے اسے ایک بلین ڈالر میں خرید لیا۔اس سے پہلے ٹوئیٹر نے مارچ ۲۰۱۱ء میں اسے خریدنے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت سسٹروم نے اسے فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

انسٹا گرام کے اثر ونفوذ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اندرونی ہلچل کے شکار متعدد ممالک نے انسٹا گرام پر پابندی عائد کردی ہے۔ البتہ اس مقبولیت عامہ اور اثر ونفوذ کے علی الرغم انسٹا گرام کو اس حوالے سے تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے کہ اس ایپ کے صارفین پر منفی نفسیاتی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ یہ

بات، مثال کے طور پر، برطانیہ کی رائل سوسائٹی آف پبلک ہیلتھ کی ریسرچ سے متحقق ہوکر سامنے آئی ہے۔اس تحقیق کے لئے چودہ سے چوبیس سال کے لگ بھگ ڈیڑھ ہزار افراد پر ایک سروے کیا گیا جس میں ہر سوشل میڈیا سائٹ کو مختلف قسم کی ذہنی بیماریوں اور شخصی مسائل کے حوالے سے جانچا گیا۔جن میں ذہنی بے چینی، ڈپریشن، تنہائی، نیند کی کمی، بدزبانی جیسے خطرناک مسائل شامل ہیں۔اس تحقیق کے مطابق سوشل میڈیا ایپس صارفین کی ذہنی صحت کے لئے خطرناک ثابت ہورہے ہیں۔ریٹنگ کے لحاظ سے تمام سوشل میڈیا ایپس کے مقابلے میں انسٹا گرام سب سے زیادہ منفی اثرات مرتب کرنے کے حوالے سے پہلے نمبر پر ہے۔ ۲۰۱۸ء میں امریکی نوجوانوں پر کیے گئے ایک سروے میں یہ نتیجہ نکلا کہ ۴۰ رفیصد نوجوان انسٹا گرام کے لائکس نہ بڑھنے کی وجہ سے ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ دوسروں سے اپنے لائکس کا مقابلہ کرنے کے اس دباؤ کے خاتمے کے لئے انسٹا گرام نے چھ ملکوں میں، جن میں آسٹریلیا، اٹلی، آئرلینڈ، جاپان، برازیل اور نیوزی لینڈ شامل ہیں، یہ تجربہ کیا ہے کہ پوسٹس پر لائکس کی تعداد دکھائی نہیں دے گی۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے فیس بک کی پالیسی ڈائریکٹر میا گارلک کا کہنا ہے کہ ''ہمیں امید ہے ہمارا لائکس ظاہر نہ کرنے کا یہ تجربہ کامیاب رہے گا اور اس سے صارفین لائکس کی پرواہ کیے بغیر اپنے خیالات لوگوں تک پہنچائیں گے۔'' انہوں نے مزید کہا کہ ''ہم انسٹا گرام کو ایسا پلیٹ فارم بنانا چاہتے ہیں جہاں لوگ بلا جھجک اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔'' انسٹا گرام کے سی ای او ایڈم موسیری کا مزید کہنا تھا کہ ہم انسٹا گرام کو جائے مقابلہ نہیں بنانا چاہتے جہاں لوگ اپنے لائکس اور کمنٹس کو لے کر ایک دوسرے سے مقابلہ کریں۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے چاہنے والے آپ کے لائکس کی تعداد دیکھنے کے بجائے صرف آپ کی تصاویر اور ویڈیوز دیکھیں۔''

تاہم انسٹا گرام کو اپنے جذبات کے اظہار اور اپنی شناخت بنانے کے حوالے سے ایک بہتر سوشل میڈیا ایپ سمجھا جاتا ہے۔اس کا ستعمال تجارت کے لئے بھی کیا جاتا ہے مختلف کمپنیاں اس کے ذریعے اپنے مصنوعات کو عام کرتی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس پلیٹ فارم کو دین کے فروغ کے لیے استعمال کرنا بھی شروع کیا ہے۔ چنانچہ یہاں بہت سے ایسے پیج بھی ہیں جہاں مستند حوالے کے ساتھ دینی باتیں شیئر کی جاتی ہیں۔قرآن وحدیث اور شریعت کی تعلیمات، سلف صالحین کے ایسے عمدہ اقوال وغیرہ، جن کو تلاش کرنے کے لئے ضخیم کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا، دلچسپ ڈیزائن اور عمدہ کیپشن کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ ان کے ذہن ودماغ کو اپیل کرسکے۔ایسے پیجز میں چند ایک درج ذیل ہیں: مصلحون

(moslehoon.quran@) اور التوحید (attawheedchannel@) وغیرہ عربی زبان میں۔ اقتباس ڈیلی (IqtibasDaily@)؛ اور اسلامک نالج (islamic_knowledg@) وغیرہ اردو زبان میں۔ اقتباس ہندی (IqtibasHindi@) اور اسلام ان ہندی (islaminhindi@) وغیرہ ہندی زبان میں۔ اقتباس انگلش (IqtibasEnglish@)؛ اور آن توحید (_on_tawheed@) وغیرہ انگریزی زبان میں۔ کچھ لوگ اس طرح کے مثبت مواد کی تخلیق کر کے ثواب بٹور رہے ہیں تو کچھ ان تعمیری پیجز کو فروغ دے کر۔ لیکن دوسری طرف ایک جم غفیر ہے جو انسٹاگرام کا استعمال فحش و بے حیائی پر مبنی مواد سے لطف اندوز ہونے اور اسے فروغ دینے کے لیے کرتا ہے۔ کتنی ہی مسلم خواتین چند لائکس اور کمنٹس کی خاطر اپنی تصاویر شیئر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ یہ امت مسلمہ بالخصوص تحریک اسلامی اور اس کے نوجوانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

دیگر سوشل ایپس کی طرح انسٹاگرام بھی بذات خود نہ مفید ہے نہ ہی مضر، بلکہ یہ استعمال کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اس کا صحیح استعمال کر کے اسے اپنی دنیا و آخرت کے لیے مفید بناتا ہے یا غلط استعمال کر کے اسے اپنی اور دوسروں کی بربادی کا ذریعہ بناتا ہے۔ اگر آپ انسٹاگرام کا استعمال کرتے ہیں تو آپ کو چاہیے کہ آپ اچھے پیجز کو فالو کریں، مثبت اور تعمیری پیغامات عام کریں، اس کے ذریعے کچھ اچھی چیزیں سیکھیں اور اسے محض تفریح اور وقت گزاری کا ذریعہ نہ بنائیں۔

ابنِ صفی۔ عظیم مفکر، بے مثل ادیب

عبداللہ زکریا

ادب برائے ادب کہ ادب برائے زندگی؟ یہ ایک ایسی بحث ہے جس نے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیا ہے اور دونوں کے پاس اپنے دلائل اور نظائر ہیں۔ ادب برائے ادب کی ایک جامع تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا رخ خارج سے داخل کی طرف ہوتا ہے اور ادب برائے زندگی میں یہ ترتیب الٹ جاتی ہے اور یہاں رخ داخل سے خارج کی طرف ہوتا ہے۔ ادب برائے ادب میں حظ اور جذباتی آسودگی ہی اصل مقصد اور منتہا ہے، جب کہ ادب برائے زندگی میں کسی خاص نظریہ کی اشاعت اور تبلیغ مقصود ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک اس کا ایک اعلی نمونہ ہے۔ تحریکِ اسلامی کی کاوشوں کے نتیجہ میں بھی جو ادب پروان چڑھا وہ بھی اسی زمرے میں شامل ہے۔ ادب میں جب تک حسنِ خیال اور حسنِ بیان شامل نہ ہو اس کی ادبی قدر و منزلت ہمیشہ شک کے گھیرے میں رہے گی۔

ترقی پسند تحریک اپنی تمام تر نمو اور جدت کے باوجود ایک اعلیٰ درجے کا ادب نہیں پیدا کر سکی۔ ممتاز حسین، جو ترقی پسند تحریک کا ایک بہت نمایاں نام ہے، ان کے حوالے سے مشفق خواجہ نے ایک کالم میں لکھا تھا کہ آخری عمر میں تاسف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پورا ترقی پسند لٹریچر 'مسجد قرطبہ' جیسی ایک نظم نہیں پیش کر سکتا ہے۔ کسی نظریہ کے تحت ایک اعلیٰ درجہ کا ادبی شہ پارہ تخلیق کرنا بہت مشکل ہے۔ اقبال کی عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ ایک مخصوص نظریے کے تحت انھوں نے جو کچھ لکھا وہ شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ ابنِ صفی کو بھی ہم ادیبوں کی اسی صف میں رکھ سکتے ہیں۔ حالاں کہ ان کا نام سنتے ہی ادبِ عالیہ والے ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ انھوں نے جاسوسی ناولوں کی شکل میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ادب ہے۔ اس نے تھکے ہوئے ذہنوں کو تفریح بھی فراہم کی ہے اور اس کے ساتھ ان کے یہاں جو اخلاقیات کا درس ہے اسے بھی نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ابنِ صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ وہ نارہ میں پیدا ہوئے۔ نوح ناروی اردو کے ایک بہت معتبر شاعر

ہیں۔ان کا ایک شعر جو سہلِ ممتنع کے زمرے میں آتا ہے، بہت مشہور ہے:

جگر کی چوٹ اوپر سے کہاں معلوم ہوتی ہے
جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

ابنِ صفی نے شاعری اسرار ناروی کے نام سے کی۔ مزاحیہ مضامین طغرل فرغان کے نام سے لکھے اور چاردانگِ عالم میں ان کی شہرت ابنِ صفی کے نام سے ہوئی۔ تاریخ پیدائش ایک جاسوسی معمہ ہے۔ اپنے ایک مضمون 'بقلمِ خود' میں انھوں نے اپریل ۱۹۲۸ء لکھی ہے، لیکن عوام میں ۲۶/ جولائی مشہور ہے، جوان کا یومِ وفات بھی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے کتبہ پر بھی تاریخِ پیدائش ۲۶/ جولائی ہی لکھی ہے۔ ان کے پرستاروں نے اس کنفیوژن سے بچنے کے لیے اب ۲۶/ جولائی کو 'یومِ ابنِ صفی' کے نام سے منانا شروع کر دیا ہے۔

اسرار ناروی سے ابنِ صفی تک کا سفر بہت دلچسپ ہے۔ انھوں نے اپنے دو مضامین میں اس کا خلاصہ کیا ہے۔ ایک لکھنے والا اپنے معاشرے اور اس دور میں رائج رجحانات سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا ہے۔ 'بقلمِ خود' میں وہ لکھتے ہیں:

''میٹرک میں پہنچتے ہی بے پی کمیونسٹوں کا ساتھ ہو گیا۔ یہ ایسے بچہ لوگ تھے، جنھوں نے کبھی پارٹی آفس کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ کھدر پہنتے، بال بڑھاتے اور گڈری بازار (الٰہ آباد کا جون مارکیٹ) سے آٹھ آٹھ آنے کی پرانی عینکیں خرید لاتے تھے اور کمیونسٹ کہلائے جانے کے شوق میں اچھی بھلی آنکھوں کا تیا پانچہ کر بیٹھتے تھے۔ بہرحال ان کا ساتھ ہوتے ہی ظالم سماج اور سرمایہ داری میری شاعری میں گھس آئے تھے۔ ان دنوں محلے کے بنیے کو سرمایہ دار سمجھتا تھا اور برادری ظالم سماج معلوم ہوتی تھی۔ کیوں کہ برادری سے باہر شادی کرنے سخت ترین پابندیاں عائد تھیں، لہٰذا اپنے ہی خاندان کے کچھ بزرگ سماج کے ٹھیکے دار ٹھہرے تھے اور دل ہی دل میں ان پر غرا کر ظالم سماج کے خلاف شاعری کیا کرتا تھا اور جب محلے کا بنیا کسی قرض خواہ سے الجھ پڑتا تو سرمایہ داری کی شامت آ جاتی۔ ایسی دل دہلا دینے والی نظم لکھتا کہ بعد میں اس بنیے پر بھی رحم آنے لگتا۔ دوسری عالمگیر جنگ شباب پر تھی اور میں اس الجھن میں پڑا رہتا تھا کہ آخر عالمی امن کا داعی روس کیوں نازی جرمنی کا ساتھ دے رہا ہے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اچانک روس اور جرمنی بھی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے اور میرے کھدر پوش ساتھیوں نے ہٹلر کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ میں نے چپ چاپ اپنا کھدر کا سوٹ اتار کر رکھا، بال ترشوائے اور آدمی کی جون میں آ گیا۔''

یہ مضمون ابنِ صفی نے ۱۹۷۲ء میں 'بقلمِ خود' کے نام سے لکھا تھا۔ دراصل بیسویں صدی کے ابتدائی حصہ

میں روس میں جو انقلاب آیا تھا، اس نے تاریخ کے دھارے کو یکسر موڑ دیا تھا۔ اس انقلاب کے اثرات زندگی کے ہر شعبہ میں دکھائی دے رہے تھے۔ آرٹ اور ادب میں بھی ایک انقلابی تحریک اس کے نتیجہ میں وجود میں آئی، جسے ہم ترقی پسند تحریک کے نام سے جانتے ہیں۔ مارکس اور لینن کے خیالات سے پوری دنیا کی نوجوان پیڑھی بہت متاثر تھی۔ اردو میں بھی ترقی پسند تحریک انھیں خیالات کا شاخسانہ تھی اور اس دور میں ہر ادیب اور شاعر کے لیے ضروری تھا کہ اگر اسے اپنے آپ کو منوانا ہے تو ترقی پسند تحریک کے ساتھ اس کی وابستگی لازمی تھی۔ اپنے ایک دوسرے مضمون 'میں نے لکھنا کیسے شروع کیا' میں وہ اس دور کو کچھ اس طرح سے یاد کرتے ہیں:

''ان دنوں ترقی پسندی کا بڑا زور تھا۔ کسی شاعر کا تعارف کراتے وقت لوگ یہ ضرور کہتے کہ جناب ترقی پسند شاعر ہیں اور جس سے تعارف کرایا جاتا وہ سمجھ لیتا تھا کہ ان کی شاعری طبلے سارنگی کے لیے بالکل بے کار ہوگی۔ ان دنوں عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ کوئی نئی بات کہہ دینا ہی ترقی پسندی ہے۔ جگر اور جوش کے رسیا آزاد نظم لکھنے والے کو ترقی پسند شاعر سمجھتے۔''

درج بالا اقتباسات نقل کرنے کا مقصود یہ ہے کہ کس طرح ابنِ صفی بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح اپنے عہد کے رجحان سے متاثر تھے اور کس طرح انھوں نے بہت جلدی اپنے آپ کو اشتراکیت اور ترقی پسندی سے دور کیا۔ کیوں کہ ان کی بعد کی تحریریں خالص 'اسلامی' ہیں۔ ہم اپنے مضمون میں ان کے ناولوں اور 'پیش رس' سے اقتباسات پیش کر کے اپنے اس دعوی کی دلیل ضرور لائیں گے۔

جاسوسی ناول لکھنے کی شروعات کیسے ہوئی، اس کے بارے میں وہ اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''جاسوسی ناولوں کا سلسلہ ۱۹۵۲ء میں شروع کیا تھا۔ اس کی تحریک ایک مباحثہ سے ہوئی۔ ایک بزرگ کا خیال تھا کہ اردو میں صرف جنسی کہانیاں ہی مارکیٹ بنا سکتی ہیں۔ (ان دنوں سچ مچ اردو میں ایسی کہانیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔)

میں ان بزرگ سے اتفاق نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا کہ اگر سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو اور بھی راہیں نکل سکتی ہیں۔ کچھ اور بھی کرنا چاہیے کا مطالبہ بالآخر پورا ہو گیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک جاسوسی ماہنامے کی داغ بیل ڈالی گئی اور میں اس کے لیے ہر ماہ ایک ناول لکھنے لگا۔''

جو لوگ ابنِ صفی کے ناول 'مخربِ اخلاق' سمجھتے ہیں، وہ ابنِ صفی کا یہ 'اعترافِ جرم' ضرور پڑھیں۔ خود ابنِ صفی کا مطمحِ نظر کیا تھا اور ان کے ناولوں کی بنیادی تھیم کیا تھی اس پر روشنی ڈالنے والا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''بہت بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں، ورنہ میں نے بھی

آفاقیت کے گیت گائے ہیں۔عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں،لیکن ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا،اس نے میری پوری شخصیت کوتہہ وبالا کر کے رکھ دیا۔سڑکوں پرخون بہہ رہا تھااور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے سوکھے سہمے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوتے ہی پھر پناہ گاہوں سے باہر آگئے اور چیخنا شروع کر دیا، یہ نہ ہونا چاہیے تھا، بہت براہوا،لیکن ہوا کیوں؟تم تو بہت پہلے سے یہی چیخ رہے تھے۔تمہارے گیت دیوانگی کے اس طوفان کو کیوں نہ روک سکے؟میں سوچتا،سوچتارہا۔آخرکاراس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا،یہی سب ہوتا رہے گا۔یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھےاور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لئے منتخب کی تھی۔تھکے ہارے ذہنوں کے لیے تفریح بھی مہیا کرتا اور انھیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔فریدی میرا آئیڈیل ہے، جوخود بھی قانون کا احترام کرتا ہےاور دوسروں سے قانون کا احترام کرانے کے لیےاپنی زندگی تک داؤ پرلگا دیتا ہے۔''(میں نے لکھنا کیسے شروع کیا۔)

ابنِ صفی نے اپنا پہلا ناول 'دلیر مجرم' ۱۹۵۲ء میں لکھااور ۱۹۸۰ءتک مسلسل لکھتے رہے۔ بیچ میں تین سال وہ اسکیز وفرینیا (schizophrenia) کا شکار رہے۔ان کا آخری ناول 'آخری آدمی' تھا، جس کے کچھ صفحات ان کے بسترِ مرگ سے ملے۔ان کی شریکِ حیات محترمہ فرحت آرا نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ہمارے پاس اب دستاویزی ثبوت ہیں کہ اس ناول کے صرف چند ابتدائی صفحات ہی ابنِ صفی کے لکھے ہوئے ہیں۔۱۹۵۲ء سے ۱۹۰۸ءتک کے عرصہ میں انھوں نے ڈھائی سو(۲۵۰) سے زیادہ ناول لکھے،جن کا مرکزی خیال قانون کا احترام اوراس کی بالادستی ہےلیکن ساتھ ہی اس کے ذریعہ وہ ایک واضح مشن کے تحت وہ اصلاحی ادب بھی تخلیق کررہے تھے۔خیر وشر کی جو کشمکش ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہے، وہ ابنِ صفی کے ناولوں کا بنیادی مضمون ہے۔یہ کشمکش کبھی انفرادی ہوتی ہے،یعنی جب انسان اپنے اندر پائے جانے والے بدی کے رجحانات پرقابو پانے کی کوشش کرتا ہےاور خیر کے جذبے کواور پروان چڑھاتا ہےاور کبھی معاشرتی کہ جب صالح روایات کاٹکراؤفکری کجی اور انتشار سے ہوتا ہےاور کبھی یہ کشمکش بین الاقوامی سطح پرپہنچ جاتی جاتی ہے، جہاں خیر وشر کا تصادم عالمی سطح پر ہوتا ہے۔ہمیں یہ تینوں طرح کی کشمکش ابنِ صفی کے ناولوں میں دکھائی دیتی ہے۔لیکن ان کا انداز نہ واعظانہ ہےاور نہ خطیبانہ۔قاری تک پیغام پہنچ جاتا ہے،لیکن وہ بوریت کا شکارنہیں ہوتا ہے۔

یوں تو ابنِ صفی کے تمام ناول ہی اخلاقیات کا درس دیتے ہیں اوران میں اسلامی روح پائی جاتی ہے، لیکن ایک ناول 'دشمنوں کا شہر'تو مکمل اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا مظہر ہے۔پہلے اس کے 'پیش رس' میں ابنِ

صفی نے لکھا ہے:

''اس کہانی میں آپ کو ایک برا آدمی ملے جو اچھا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسے آدمیوں کی راہ میں کیسی دشواریاں آ کھڑی ہوتی ہیں، لیکن وہ لوگ جو جد و جہد کرتے رہنے کے عادی ہیں پیچھے نہیں ہٹتے۔ پیچھے ہٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو آدمی سمندر کا سینہ چیر سکتا ہے، پہاڑوں کے دل دہلا سکتا ہے، طوفان سے ٹکرا سکتا ہے کیا وہ اپنی کمزوریوں سے لڑ نہیں سکتا؟ کیا وہ اپنی خواہشات کا گلا نہیں گھونٹ نہیں سکتا؟ اگر اسے اپنی لامحدود قوتوں کا احساس ہو جائے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ نادر ایک ایسا ہی کردار ہے۔ وہ بڑی پامردی سے حالات کا مقابلہ کرتا ہے اور بالآخر فتح اسی کی ہوتی ہے۔''

نادر اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ وہ ایک چھٹا ہوا بدمعاش تھا اور رام گڑھ کا زلزلہ کہلاتا تھا۔ اس نادر زندگی میں جو انقلاب آیا اس کا محرک صرف ایک جملہ تھا:

''اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہوئے تو انھوں نے ان لوگوں سے انتقام نہیں لیا جو ان پر اوجھڑیاں پھینکتے تھے۔ ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے تھے۔ ان پر پتھر پھینکتے تھے۔ ان تمام لوگوں کے لیے کھلی معافی تھی جنھوں نے انھیں ہجرت پر مجبور کیا تھا۔''

اقتباس طویل ہے، لیکن اس کے ذریعہ پورا واقعہ نگاہ کے سامنے آ جائے گا:

''وہ انقلاب اس وقت ہوا تھا جب وہ ایک دشمن سے انتقام لینے جا رہا تھا۔ وہ یقیناً اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ کیوں کہ کچھ دن پہلے اس نے بھرے مجمع میں اس کی توہین کی تھی اور نادر نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسے زندہ نہ چھوڑے گا۔ وہ اس رات اسی ارادے سے نکلا تھا۔ اس کی جیب میں بے آواز ریوالور بھی موجود تھا اور حالات ایسے تھے کہ وہ بڑی آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا، لیکن راہ میں ایک واعظ کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسے مذہب سے ذرہ برابر بھی لگاؤ نہیں تھا اور وہ کبھی مذہبی جلسوں کی طرف رخ بھی نہیں کرتا تھا، مگر اس رات محض واعظ کی خوش گلوئی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ واعظ تقریر کرنے سے پہلے نظم پڑھ رہا تھا اور پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ نادر بے اختیار اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ یوں بھی اسے دو گھنٹے تک ادھر ادھر رہنا تھا کیوں کہ کام کا وقت تو پروگرام کے دو گھنٹے بھی ہی آتا۔ وہ جلسہ گاہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ نظم ختم ہونے پر تقریر شروع ہوگئی اور نادر بس بیٹھا رہ گیا۔ اس نے سوچا یہیں کیوں نہ دو گھنٹے گزار دئے جائیں۔ تقریر رسول کریم ﷺ کی سیرت پر تھی۔ نادر کا سر خود بہ خود جھکتا چلا گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے واعظ کا ایک

ایک لفظ کانوں سے گزر کر اس کی روح میں تحلیل ہو رہا ہوا اور پھر جب واعظ اس موضوع پر کہ آپ نے کبھی کوئی منتقمانہ کاروائی نہیں کی تو نادر کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے سنا کہ رسول کریم ﷺ نے اس عورت سے بھی انتقام نہیں لیا، جس نے ان کے چچا کا جگر تک چبا ڈالا تھا۔ اس نے سنا کہ طائف والوں نے پتھر مار مار کر رسولِ کریم ﷺ کا سارا جسم لہولہان کر دیا تھا، لیکن اس حال میں بھی دنیا کے سب سے بڑے انسان نے ان کی بہتری کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ نادر نے یہ سب سنا اور بچوں کی طرح رو پڑا۔

قرآن میں اللہ فرماتا ہے: **الم یان للذین آمنو ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ.**

نادر کے لیے وہ وقت آ گیا تھا۔''

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح کے واقعات کا اثر وقتی ہوتا ہے۔ نادر بھی اس وقت ہلکے سے نشہ میں تھا، لیکن نشہ اترنے کے بعد بھی وہ اپنے عہد پر قائم رہتا ہے اور اس کی زندگی سرتاپا تبدیل ہو جاتی ہے۔ بہت دشواریاں آتی ہیں، لیکن وہ اپنے عہد پر قائم رہتا ہے۔ ایک رات اس کے اندر پرانا نادر جاگ پڑتا ہے اور سلویا نام کی جس عورت کا ملازم ہے، اس کے تئیں اس کی نیت خراب ہو جاتی ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتا ہے۔ برائی اور بھلائی کہ یہ کشمکش پورے ناول میں جاری رہتی ہے، لیکن آخر میں جیت بھلائی کی ہی ہوتی ہے۔ اس کشمکش کو بیان کرتا ہوا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اور آپ تیرہ سال کی عمر سے اس کے ساتھ رہ رہی تھیں، نادر نے پوچھا۔ اس کا ذہن پھر بھٹکنے لگا تھا۔ وہ پھر بھول گیا تھا کہ اپنی زندگی کا چلن بدل دینے کا عہد کر چکا ہے۔ ہاں میں اسی کے ساتھ رہتی تھی۔ ہاں میں اسی کے ساتھ رہتی تھی، سلویا نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ نادر کی آنکھ سے درندگی جھانک رہی تھی۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اب عقاب اس ننھے سے پرندے پر جھپٹ پڑے گا۔ مگر وہ پھر بھرائی آواز میں بولی، خدا دیکھ رہا ہے۔ ایک نہ ایک دن میں گن گن کر بدلے چکاؤں گی۔ میرا باپ مجبور ہے، میں مجبور ہوں لیکن وہ مجبور نہیں جس نے مجھے اور میرے باپ کو پیدا کیا تھا۔ نادر کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ اتنی تیز کہ اب سلویا کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ خدا مجبور نہیں ہے، خدا مجبور نہیں ہے۔ ان گھنٹیوں کی آواز کے درمیان کوئی چیخ رہا تھا، یقیناً خدا مجبور نہیں ہے''۔

شراب جسے ام الخبائث کہا گیا ہے، اس سے اجتناب ابنِ صفی کے تمام مثبت کرداروں کا خاصہ ہے۔ سارجنٹ حمید نے ایک دوبار یہ غلطی کی لیکن اس کی جو سزا ملی اس نے ہمیشہ کے لیے اس سے شراب چھڑوا دی۔

'جونک اور ناگن' کا ایک اقتباس یاد آ رہا ہے۔ تنویر جو ایکسٹو کی ٹیم کا ایک حصہ تھا، ایک مہم میں حادثہ کا شکار ہو کر فیلڈ ورک کے قابل نہیں رہ جاتا ہے اور اس جگہ سارجنٹ نیمو لیتا ہے، جسے شراب سے اجتناب نہیں ہے۔ اس اقتباس سے آپ کو سمجھ میں آ جائے گا کہ انھوں نے کس فطری انداز میں اس ام الخبائث کی برائی کو اجاگر کیا ہے۔ یہ مکالمہ صفدر اور نیمو کے درمیان چل رہا ہے:

''یار بس ختم کرو۔ ہوگا کچھ۔ میں ایک آدھ پیگ برانڈی کا لینا چاہتا ہوں۔'' (نیمو)

''ایک پیگ سے زیادہ نہیں۔'' (صفدر)

''تنہا پینے میں مزہ نہیں آتا، تم بیئر ہی لے لینا۔'' (نیمو)

''میری فکر نہ کرو۔'' (صفدر)

''یار کیا مصیبت ہے۔ تم لوگ مولوی کیوں ہو گئے ہو؟'' (نیمو)

''اللہ کا حکم۔'' (صفدر)

''مت بور کرو۔'' (نیمو)

''اسی کو غنیمت جانو کہ مجھے تمہاری شراب نوشی پر اعتراض نہیں ہے۔'' (صفدر)

''بڑے ان کلچرڈ لوگ ہو۔'' (نیمو)

''شراب سے اجتناب ہمارے کلچر کا جزوِ لازمی تھا۔ مقصد یہ تھا کہ نیند کے علاوہ ہمارا ایک لمحہ بھی بے خبری میں نہ گزرے۔'' (صفدر)

''اب اخلاقیات پر بور کرو گے۔'' (نیمو)

''بے زار ہو اخلاقیات سے۔'' (صفدر)

''حد سے زیادہ۔'' (نیمو)

''لیکن اگر تمہارے والد صاحب بھی اخلاقیات سے متنفر ہوتے تو تمہارے کاغذات میں ولدیت کا خانہ 'نامعلوم' سے مزین نظر آتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کہیں اخلاقیات طرۂ امتیاز کیوں ہوتی ہے اور کہیں ایک فضول چیز کیوں بن جاتی ہے۔'' (صفدر)

''بس بس یہ موضوع ختم کرو۔ کوئی اور بات کرو۔'' (نیمو)

''کبھی میں بھی پیتا تھا، لیکن اب توبہ کر لی ہے اور بتاؤں کیسے۔ ایک بار عمران صاحب نے سور کا گوشت سامنے رکھ دیا تھا۔ میں بگڑ گیا۔ کہنے لگے کیا حرج ہے؟ دونوں حرام ہیں۔ اگر ایک سرور بخشتی ہے تو یہ بے حد لذیذ اور طاقتور ہوتا ہے، ذرا چکھ کر دیکھو''۔ (صفدر)

فلم اور فلمی ستاروں سے ہمیں جو انسیت ہے اور ہم جس طرح سے ان کے دیوانے ہیں اس کے تعلق سے 'ستاروں کی موت' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ وہ بین السطور کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہیں:

''تم فلم اسٹاروں کی منطق میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' (یہ سارجنٹ حمید کہہ رہا ہے۔)

''ہماری کیسی منطق؟''

جب تمہارا نام شیریں بانو تھا، تو تم نے آشا کیوں اختیار کیا؟

اوہ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''تم سمجھتے نہیں، فن کار کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ فن ہی اس کا مذہب ہوتا ہے۔ وہ نہ ہندو ہوتا ہے اور نہ مسلمان۔''

فلم صنعت کو اس سے بہتر کوئی اور نہیں سمجھا سکتا ہے۔

ابنِ صفی کے مثبت کردار ہمیشہ جنس کے معاملے میں پاک دامنی کا ثبوت دیتے ہیں۔ فریدی تو خیر 'ہارڈ اسٹون' ہے اور لڑکیوں کی ہمت اس تک پہنچنے کی نہیں ہوتی، لیکن سارجنٹ حمید کی بھی ساری عیاشی لفظی ہے۔ عمران پر ہر ناول میں کوئی نہ کوئی لڑکی عاشق ہو جاتی ہے، لیکن عمران کسی کو گھاس نہیں ڈالتا۔ تھریسیا کو بھی نہیں۔ جولیانا کو ہمیشہ باتوں میں اڑا دیتا ہے اور اس کے جذبات کا مذاق اڑاتا رہتا ہے۔ اباحیت مغربی سماج میں بہت عام بات ہے۔ 'ادھورا آدمی' میں دیکھیے ابن صفی کیسے ہمیں مشرق اور مغرب کا فرق غیر محسوس طریقے سے کراتے ہیں۔ لسلی اور جولیانا کے مابین یہ مکالمہ ملاحظہ فرمائیں:

'جہنم میں جائے' لسلی پیر پٹخ کر بولی۔ اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہم نے دو راتیں اس ہٹ میں اجنبیوں کی طرح بسر کی ہیں۔ مجھے تو وہ خود بھی عورت معلوم ہوتا ہے۔

''جولیا نے قہقہہ لگایا....''۔

خاموش رہو۔ لسلی بپھر گئی۔

وہ یوروپین مردوں کی طرح کتا نہیں ہے۔ جولیا نے لسلی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''

ابنِ صفی کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ سماج کا ایک طبقہ مغربی روایات اور کلچر سے متاثر ہو کر اپنی روایات سے باغی ہو رہا ہے۔ وہ کئی جگہ یہ نوحہ کرتے ہیں۔ 'شیطانی جھیل' سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

''وہ بیٹھ ہی رہے تھے کہ ایک جوڑا تھرکتا ہوا اپنی میز سے اٹھا اور رقص کے فرش پر چلا آیا۔ کچھ دیر تک صرف وہی دونوں ناچتے رہے، پھر دوسروں نے بھی ان کی تقلید شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا فرش بھر گیا۔

سائرہ منھ دبائے ہنس رہی تھی۔

آپ ہنس رہی ہیں؟ حمید بولا

واقعی مجھے ہنسنا نہیں چاہیے۔ وہ یک بیک سنجیدگی اختیار کر کے بولی، رونے کا مقام ہے۔ یہ لڑکیاں جو کل تک پردے میں رہتی تھیں، آج یہاں سینکڑوں کی موجودگی میں کتنی بے حیائی سے اپنے جسموں کو حرکت دے رہی ہیں۔''

ابنِ صفی کے عہد میں ایک وقت ٹیڈی بوائز اور ٹیڈی گرلز کا کلچر بہت عروج پر تھا۔ 'ڈیڑھ متوالے' میں وہ اس پر طنز کرتے ہیں:

''اس لڑکی کی پتلون تو ڈھیلی ہی کرا دیجیے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دو تربوز آپس میں لڑتے، جھگڑتے چلے جا رہے ہوں۔''

یہ تو چند اقتباسات ہم نے مشتے نمونے از خروارے نقل کر دیے ہیں۔ ابنِ صفی کے تمام ناولوں میں اس قبیل کے جملے بکھرے پڑے ہیں۔

ابنِ صفی جرم اور مجرم کی نفسیات کے بھی نباض ہیں۔ ان کے ناولوں میں مجرم کیفرِ کردار کو تو پہنچتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ بین السطور یہ پیغام بھی دیتے جاتے ہیں کہ جرم کے محرکات ختم کرنا زیادہ ضروری ہے۔ 'خطرناک بوڑھا' کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو:

(فریدی نے کہا) بروں سے زیادہ برائی کی طرف دھیان دیا جائے۔ یہ سوچا جائے کہ آخر جرم کیے ہی کیوں جاتے ہیں؟ کیوں نہ سماجی زندگی کو اس معیار پر لایا جائے، جہاں جرم کا سوال ہی نہ رہ جائے۔

مگر یہ کس طرح ممکن ہے؟ حمید بولا

ہم جو بھی کرتے ہیں اپنی آسودگی کے لیے کرتے ہیں۔ اگر سوسائٹی میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں، جن کے تحت ہم اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے آسانی سے جائز طریقے اختیار کر سکیں تو پھر ہمیں انہی خواہشات کو آسودہ کرنے کے لیے ناجائز راستوں پر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

ابنِ صفی کا ماننا تھا کہ مستقبل سے مایوسی اصل میں جرائم کی بنیاد ہے۔ 'مہلک شناسائی' کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

''مستقبل سے مایوسی غلط فہمی کی پیداوار ہے اور آدمی کو جرائم کی طرف لے جاتی ہے۔ مستقبل

سے مایوس ہوکر یا تو آدمی جرائم کرتا ہے یا پھر کسی ایسے کرنل فریدی کی تلاش میں ذہنی سفر کرتا ہے، جو قانون اور انصاف کے لیے بڑے سے بڑے چہرے پر مکا رسید کر سکے۔''

'گارڈ کا اغوا' میں وہ اسی خیال کو اپنے دو کرداروں کے ذریعہ بڑی خوبی سے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں:

''مجھے جاسوسی کہانیاں بہت پسند ہیں۔

تمہاری لائن کی چیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ جاسوسی کہانیاں تباہ کن ہوتی ہیں۔

کیوں؟

ان سے جرائم پھیلتے ہیں۔

میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ راجن نے سر ہلا کر کہا۔ ہمارے یہاں کے زیادہ تر جرائم پیشہ لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ ننانوے فیصد جاہل ہوتے ہیں۔ جرائم کی جڑیں دراصل مایوسی میں ملتی ہیں

میں سمجھی نہیں!

جس معاشرے کے لوگ مستقبل کی طرف سے مایوس ہوجاتے ہیں وہیں جرائم کی گرم بازاری بھی ہوتی ہے۔

تو کیا یہاں کے لوگ مستقبل سے مایوس ہیں؟

یقیناً ہیں اور یہ چیز ان کے ذہنوں میں جڑیں پکڑ چکی ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔''

تخریب پسندی پر ان کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیں:

''بیسویں صدی کے نصف کے بعد کا ذہن جھنجھلاہٹ کا شکار ہے۔ تم جانتی ہو کہ تخریب پسندی کی بنیاد جھنجھلاہٹ ہی پر ہوتی ہے اور یہ جھنجھلاہٹ تخریب کاری کے لیے بہانے تلاش کرتی رہتی ہے اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ غیر یقینی حالات نے آدمی کو مستقبل سے مایوس کر دیا ہے، لہٰذا وہ ہر چمک دار چیز کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے، خواہ وہ آگ ہی کیوں نہ ہو۔'' (رائی کا پربت)

ابنِ صفی کی اسی فنکارانہ چابک دستی کا کمال ہے کہ ہمیں ان کے بعض منفی کرداروں سے بھی ہمدردی محسوس ہونے لگتی ہے۔ فریدی کی ناک میں دم کرنے والا ننھا شیطان فنچ قانون شکن ہے، لیکن ہمیں پھر بھی اس سے ہمدردی ہے۔ کیوں کہ ہمیں علم ہے کہ وہ اپنے اوپر ہوئے ظلم کا انتقام لینے کے لیے شیطانوں کی ٹولی کا حصہ بنا ہے۔ 'بے چارہ شہزور' کا کلائمکس ہماری آنکھیں نم کر دیتا ہے۔ علامہ دہشت ناک جو کہ یونیورسٹی میں شوشیالوجی کا پروفیسر ہے اور صرف اپنے اجداد پر ہوئے ظلم کا بدلہ لینے کے لیے زندہ ہے، جب وہ عمران کے ہاتھوں گرفتار ہوتا ہے اور حوالات میں پہنچتا ہے تو اس کی ساری شخصیت ہی بدل جاتی ہے۔ اس کا بچپن لوٹ آتا

ہے اور وہ بچوں کی آواز میں صرف ماں بابا بولتا ہے اور پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر عمران اپنا سر پکڑ لیتا ہے۔ دراصل علامہ کا پورا خاندان ایک طاقتور زمین دار فیملی کے ہاتھوں بربریت کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھر بند کر کے آگ لگا دی جاتی ہے۔ پورا خاندان آگ میں جل کر مر جاتا ہے، صرف ایک چھوٹا بچہ بچ جاتا ہے۔ یہی بچہ بڑا ہو کر علامہ دہشت ناک بنتا ہے اور دھیرے دھیرے بہت چالاکی سے اس زمین دار فیملی کے ایک ایک فرد کو اپنا شکار بناتا ہے۔ صرف میاں توقیر بچے تھے، جو اس کا آخری شکار تھے۔ لیکن وہ عمران کی وجہ سے بچ جاتے ہیں اور علامہ گرفتار ہو جاتا ہے۔ علامہ کی ساری زندگی جذبۂ انتقام کے اردگرد گھوم رہی ہے اور ناکامی کی صورت میں وہ پھر سے اپنے بچپن کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ ابنِ صفی ہمارے دلوں میں علامہ کے لیے ہمدردی کے جذبات تو ابھارتے ہیں، لیکن ساتھ میں اہم اہم بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں:

> ''ہم سب درندے ہیں، مائی ڈیر فیاض۔ سب کچھ سامنے آجائے گا۔ باقاعدہ رپورٹ مرتب کر کے تمہارے حوالے کر دوں گا، جسے عدالت میں پیش کر سکو گے۔ لیکن اس شخص کے لیے میرا دل رو رہا ہے۔ کاش اس کے انتقامی جذبے نے انفرادی رنگ اختیار کرنے کے بجائے ایسی تحریکوں کا ساتھ دیا ہوتا، جو ظلم اور جبر کے نظام کو مٹا دینے کے لیے کام کر رہی ہیں۔''

ایڈلاوا کا کلائمیکس بھی ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ سفید فام اقوام کے ہاتھوں رنگ دار اقوام کے استحصال کے پسِ منظر میں لکھی گئی یہ کہانی اس بین الاقوامی لوٹ کھسوٹ اور بربریت کو اجاگر کرتی ہے، جو صدیوں سے کمزوروں پر ڈھائی جا رہی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''عمران: اور یہ بھی سن لو کہ ایڈلاوا کو مار کر میں کچھ خوش نہیں ہوں۔ وہ بھی مظلوم تھا۔ صدیوں پرانے دکھ میں مبتلا تھا۔ ان سفید فام درندوں نے امریکا کے دونوں براعظموں میں قیامت برپا کر دی تھی۔ وہ ذاتی طور پر اتنے ایٹم بن بنانا چاہتا تھا، جس سے پورے اسپین کو کھنڈر بنا سکے۔''

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابنِ صفی نے تفریح کے ساتھ تعمیر کا بھی کام کیا۔ ایک ماہر طبیب کی طرح وہ نہ صرف یہ کہ مرض کی تشخیص کرتے ہیں بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں اور اسی میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ (جاری)

جامعہ کے لیل ونہار

مولانا مصباح الباری فلاحی

ناظم جامعہ کے ہمراہ اساتذۂ کرام کی ایک نشست

جامعہ کی مرکزی لائبریری ہال میں ایک نشست جملہ شعبۂ جات کے اساتذۂ کرام کی ۱۳/جولائی ۲۰۲۱ء کو ناظم جامعہ مولانا طاہر مدنی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

مولانا مصباح الباری فلاحی ندوی کی تلاوتِ قرآن مجید سے نشست کا آغاز ہوا۔ معاون مہتمم تعلیم وتربیت مولانا عبید اللہ طاہر فلاحی نے افتتاحی کلمات میں فرمایا کہ عید الاضحیٰ کی تعطیل میں پانچ ایام کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ عید الاضحیٰ کی تعطیل ۱۹/جولائی سے ۳۰/جولائی تک رہے گی۔ ۳۱/جولائی ۲۰۲۱ء سے تعلیم دوبارہ شروع ہوگی۔ یہ تعطیل اس مرتبہ اس لیے بڑھائی گئی ہے تاکہ اساتذہ کرام، اعظم گڑھ اور مضافات کا دورہ کریں اور جامعہ کے شعبۂ مالیات کو مستحکم کرنے میں تعاون کریں۔ قرب وجوار کے علاوہ دوسرے علاقے کے اساتذۂ کرام اپنے علاقے یا حلقے سے جامعہ کے لیے تعاون کریں۔ اس وقت کووڈ۔۱۹ کی وجہ سے بہت مدارس مالی بحران کا شکار ہیں اور جامعہ بھی اس کی زد میں ہے۔ اس لیے شعبۂ مالیات کو مستحکم کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ناظم جامعہ نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ جامعہ کے شعبۂ مالیات کو مستحکم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ کووڈ۔۱۹ کی وجہ سے بہت سے مدارس بند ہوچکے ہیں یا اساتذہ کی تنخواہ نہیں دے پارہے ہیں، لیکن الحمدللہ جامعہ میں ابھی یہ صورتِ حال نہیں پیدا ہوئی ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے اور آپ تمام اساتذہ کی محنت وکوششوں کا ثمرہ ونتیجہ ہے۔ عید الاضحیٰ کی تعطیل میں تمام اساتذہ جامعہ کے شعبۂ مالیات کو مستحکم کرنے کی کوشش کریں۔ تاکہ مستقبل میں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

نظامت کے فرائض نگرانِ اعلیٰ مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب نے انجام دیے۔

اسی طرح معلمات کی ایک نشست ناظم جامعہ کی صدارت میں ۱۴/جولائی ۲۰۲۱ء کو منعقد ہوئی اور اس

نشست میں بھی جامعہ کے شعبۂ مالیات کو مستحکم کرنے پر زور دیا گیا۔

اساتذۂ کرام اور معلمات کو اپنی سہولت کے لحاظ سے مختلف حلقوں میں تقسیم کیا گیا تاکہ وہ آسانی سے مختص بستیوں کا دورہ کرسکیں۔ تقسیم کار کے پیش نظر وقتی نظام وصولی بنایا گیا اور مادر علمی کے خیر خواہوں سے گزارش کی گئی کہ ان کے علاقے میں پہنچنے والے اساتذۂ کرام اور معلمات کا بھر پور تعاون کریں اور جو علاقے خاکے میں نہیں آسکے تھے۔ وہاں کی فلاحی برادری سے خصوصی درخواست کی گئی کہ وہ خود آگے آئیں اور جامعہ کے لیے مالی تعاون کے حصول میں اپنے وقت کی قربانی دیں۔

جامعہ میں عیدالاضحیٰ کی تعطیل

جامعہ کے تعلیمی کلینڈر کے مطابق امسال عیدالاضحیٰ کی تعطیل ۱۹/جولائی ۲۰۲۱ء بروز دوشنبہ ہوئی۔ تعطیل عیدالاضحیٰ ۲۵/جولائی ۲۰۲۱ دوشنبہ تک تھی، لیکن عیدالاضحیٰ کی تعطیل سے متصل اساتذۂ کرام ومعلمات کو پانچ دنوں کی مزید چھٹی دی گئی تاکہ وہ ان پانچ دنوں میں جامعہ کے لیے مالی تعاون کے لیے ممکنہ کوشش کرسکیں اور ۳۱/جولائی ۲۰۲۱ء بروز شنبہ جامعہ میں آن لائن تعلیم کا دوبارہ آغاز ہوا۔

عربی اول (ج)، عبوری کلاس کا سالانہ امتحان اور نتائج

گزشتہ سال عربی اول (ج) کے کلاس کے طلبہ کا امتحان نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ عربی اول (ج) سکشن میں عربی اول کے کم زور طلبہ تھے۔ ان کی کچھ اضافی گھنٹیاں بھی چلتی تھیں اور اس سال عیدالفطر کی تعطیل کے بعد سے ان کی کلاس بھی مسلسل جاری تھیں۔ عیدالاضحیٰ تعطیل سے چار دن قبل حسبِ اعلان عربی اول (ج)، عبوری سکشن کا سالانہ امتحان کا آغاز ہوا اور ۴/دن تک مختلف اساتذۂ کرام نے اس سکشن کا آن لائن امتحان لیا۔ اسی طرح عربی اول کے ضمنی طلبہ کا بھی آن لائن امتحان ہوا اور ۲/اگست ۲۰۲۱ء بروز دوشنبہ عربی اول (ج) عبوری سکشن کے نتائج کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔

ایک اندوہناک خبر

جامعہ کے ایک قدیم استاد اور جامعہ کے ایک ہونہار سپوت محترم مولانا عرفان فلاحی صاحب کا ۲۵/جولائی ۲۰۲۱ء بروز یکشنبہ کو اپنے آبائی وطن ہنگائی پور میں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔ انالله وانا اليه راجعون۔ ۲۵/جولائی ۲۰۲۱ء کو دو بجے دن میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا مرحوم نے یکم جولائی ۱۹۵۶ء کو اس عالم رنگ و بو میں آنکھ کھولی۔ اس دور میں جب کہ تعلیم کی اہمیت سے زیادہ تر لوگ ناآشنا تھے۔ آپ نے ۱۹۷۵ء میں جامعۃ الفلاح سے عالمیت اور ۱۹۷۷ء میں فضیلت کی تکمیل کی۔ فراغت کے فوراً بعد ہی آپ جامعہ میں تدریس سے وابستہ ہو گئے اور یہ سلسلہ تاحیات باقی رہا۔ ۶ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو شعبۂ ثانوی میں آپ کا تقرر عمل میں آیا اور آپ اردو اور دینیات کے مضامین کی تدریس کے فرائض انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۳ر جنوری ۲۰۰۹ء سے ۶ر مئی ۲۰۱۸ء تک تقریباً ساڑھے نو سال آپ شعبۂ ثانوی کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔

جامعہ کی ۴۴ سالہ طویل خدمت کرنے کے بعد ۶۵ برس کی عمر میں آپ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ یقیناً آپ کی رحلت جامعہ کے لیے ایک بہت بڑا خسارہ ہے۔

عیدالاضحیٰ کی تعطیل کے سبب بیرونی وابستگانِ جامعہ ان کی نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہو سکے، البتہ قرب وجوار کے وابستگان اور فلاحی برادری کی کثیر تعداد تدفین میں شریک رہی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آپ کے درجات بلند فرمائے، جنت الفردوس کا وارث بنائے، تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی عطا فرمائے اور جامعہ کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

اخبار انجمن

عیدالاضحیٰ کا پیغام

عید الاضحیٰ کے موقع پر صدرِ انجمن نے فلاحی برادران کو یہ پیغام دیا کہ" قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تین حوالوں سے تذکرہ ہے: (۱) ابراہیمی مشن (۲) ابراہیمی نظر (۳) اورابراہیمی اوصاف۔ آج حضرت ابراہیمؑ کی عظیم قربانی کو یاد کرتے ہوئے ابراہیمی مشن، ابراہیمی نظر اور ابراہیمی اوصاف کو اپنی شخصیت کا حصہ بنانے کا عہد کریں۔"

وفیات

☆ جناب مبین فلاحی (فراغت: ۱۹۸۵ء) ۱۶/ اگست ۲۰۲۱ء کو اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون**۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ صدر انجمن جناب ابوالاعلیٰ سید سبحانی نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ "گزشتہ ماہ چھندواڑہ (ایم پی) سفر کے دوران برادر محترم مبین فلاحی مرحوم سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ جامعہ اور انجمن کے تعلق سے موصوف کے ساتھ تفصیلی تبادلہ خیال ہوا۔ انجمن کے آئندہ متوقعہ اجلاس میں شرکت کی یقین دہانی بھی کرائی۔ اساتذہ، اپنے زمانے کے فارغین جامعہ، بلریا گنج اور نواح کا تذکرہ اور ان سے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں۔ کیا معلوم تھا کہ برادر محترم سے یہ آخری ملاقات ہوگی۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔"

☆ ۱۹/ اگست ۲۰۲۱ء کو مولانا ابوزید فلاحی صاحب بسہم کے والد جناب توحید احمد صاحب اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ **إنا للّٰه وإنا إليه راجعون**۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Anjuman Talaba-e-Qadeem Jamiatul Falah

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

Ref No. 03/07/21

Date 15/07/21

پریس ریلیز

انجمن طلبۂ قدیم جامعہ کی زمینوں سے متعلق معاملہ کی قانونی پیروی کرے گی: صدر انجمن

جامعۃ الفلاح کی زمینوں کی پیمائش کو لے کر سامنے آنے والے معاملات کے پیش نظر 14 رجولائی 2021ء کو انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کی شوریٰ کا ایک آن لائن ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا، اس اجلاس میں ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب خصوصی مدعو کے طور پر شریک رہے۔ ناظم جامعہ نے اس بات کا یقین دلایا کہ معاملہ کو سنجیدگی سے دیکھا جائے گا، اس سلسلے میں مشورے جاری ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ان شاءاللہ بہت جلد جامعہ کی زمینوں سے متعلق یہ تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

صدر انجمن جناب ابوالاعلیٰ سید سبحانی نے معاملہ سے متعلق کچھ اہم اور بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی اور اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ لوکل سطح سے لے کر اعلیٰ سطحی عدالتوں تک جہاں کہیں بھی قانونی پیروی کی ضرورت پڑے گی، ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں گی اور انجمن اس سلسلہ میں پورا پورا تعاون کرے گی۔

اس سلسلہ میں انجمن کی جانب سے لوکل سطح پر بھی اور مرکزی سطح پر بھی ایک ایک کمیٹی تشکیل دی جارہی ہے، تاکہ کسی قسم کے کمیونی کیشن گیپ کی شکایت نہ ہو اور اس معاملہ سے متعلق فارغینِ جامعہ کی جانب سے کوئی بھی سوال آتا ہے تو اس پر فوری اور تسلی بخش رسپانس دیا جائے۔

لوکل کمیٹی کے ممبران درج ذیل ہیں:

(۱) برادر شیر افگن فلاحی، جامعۃ الفلاح (۲) ڈاکٹر نعمان فلاحی، بلریا گنج (۳) برادر شجاع الرحمٰن فلاحی، ہنگائی پور

مرکزی کمیٹی کے ممبران درج ذیل ہیں:

(۱) ڈاکٹر اعظم بیگ فلاحی، جے پور (۲) ڈاکٹر عبدالسلام فلاحی، پٹنہ (۳) حافظ تبریز فلاحی، بھیونڈی

شوریٰ کا مجموعی احساس تھا کہ اس مسئلے کے متعلق فارغین جامعہ کے درمیان بے چینی اور فکرمندی لازمی ہے، یہ مادرِ علمی سے گہری وابستگی اور قلبی تعلق کا لازمی نتیجہ ہے۔ البتہ اس سلسلے میں کوشش ہونی چاہیے کہ سوشل میڈیا پر غیر ضروری بحث و مباحثے سے اجتناب کریں اور ذمہ داران جامعہ کا ہر ممکن مادی و معنوی تعاون کریں۔

اللہ رب العزت مادرِ علمی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور اسے ہر قسم کے شر و رفتن سے محفوظ رکھے، آمین۔

محمد اسعد فلاحی

Asad

میڈیا انچارج، انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

Bilariyaganj, Azamgarh, U.P. 276121
atq.jamiatulfalah@gmail.com | www.atqjamiatulfalah.org

With best compliments from

ADHAM ALI

Managing Director

+91-9821 03 2562

Swaidan

MANPOWER CONSULTANTS

Regn. No. B0513/MUM/PER/1000+/10/8522/2009

Real Tech Park, 1013, 10th Floor, Sector 30/A
Near Vashi Railway Station, Vashi
New Mumbai-400703 (India)
Tel: +91-22-66441600, Fax: +91-22-66441688
E-mail: admin@swaidan.in
Website: www.swaidan.in

JARIDA HAYAT–E–NAU
August - 2021

RNI No: DELURD/2015/65862
Vol. VI Issue - VIII

مڈل ایسٹ میں ملازمت کے خواہش مند حضرات کے لیے

ایک قابل اعتماد ادارہ

الهند فارن سروس ایجنسی

- اگر آپ میڈیکل لائن سے متعلق ہیں
- اگر آپ کوئی ہنر جانتے ہیں
- اگر آپ صرف پڑھے لکھے ہیں اور آپ کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے
- اگر آپ کا کسی ہوٹل انڈسٹری سے تعلق ہے
- اگر آپ عام لیبر یا مزدور ہیں

تو آپ اپنے پاسپورٹ کی کاپی، فوٹو اور بائیوڈاٹا ہمیں بھیج دیجیے......اور

دیگر تفصیلات کے لیے ہماری اطلاع کا انتظار کیجیے۔

وكالة الهند للخدمات الأجنبية

AL-HIND FOREIGN SERVICE AGENCY

Registration No.: B-0376/DEL/PER/1000+/5/1263/1984

Head Off: No. 73, Main Road, Near SBI
Zakir Nagar, New Delhi-110 025 (India)
E-mail: info@al-hind.com

Ph : 0091 - 11 - 26983980, 26983981
0091 - 11 - 26988375 / 76
Fax : 0091 - 11 - 26983982

Web: www.al-hind.com

Branch Office: 38, G.F. Ashoka Shopping Complex, Near G.T. Hospital
L.T. Road, Mumbai - 400 001 (India)
Ph. : 0091-22-22652906 Fax: 0091 - 22 - 22652910